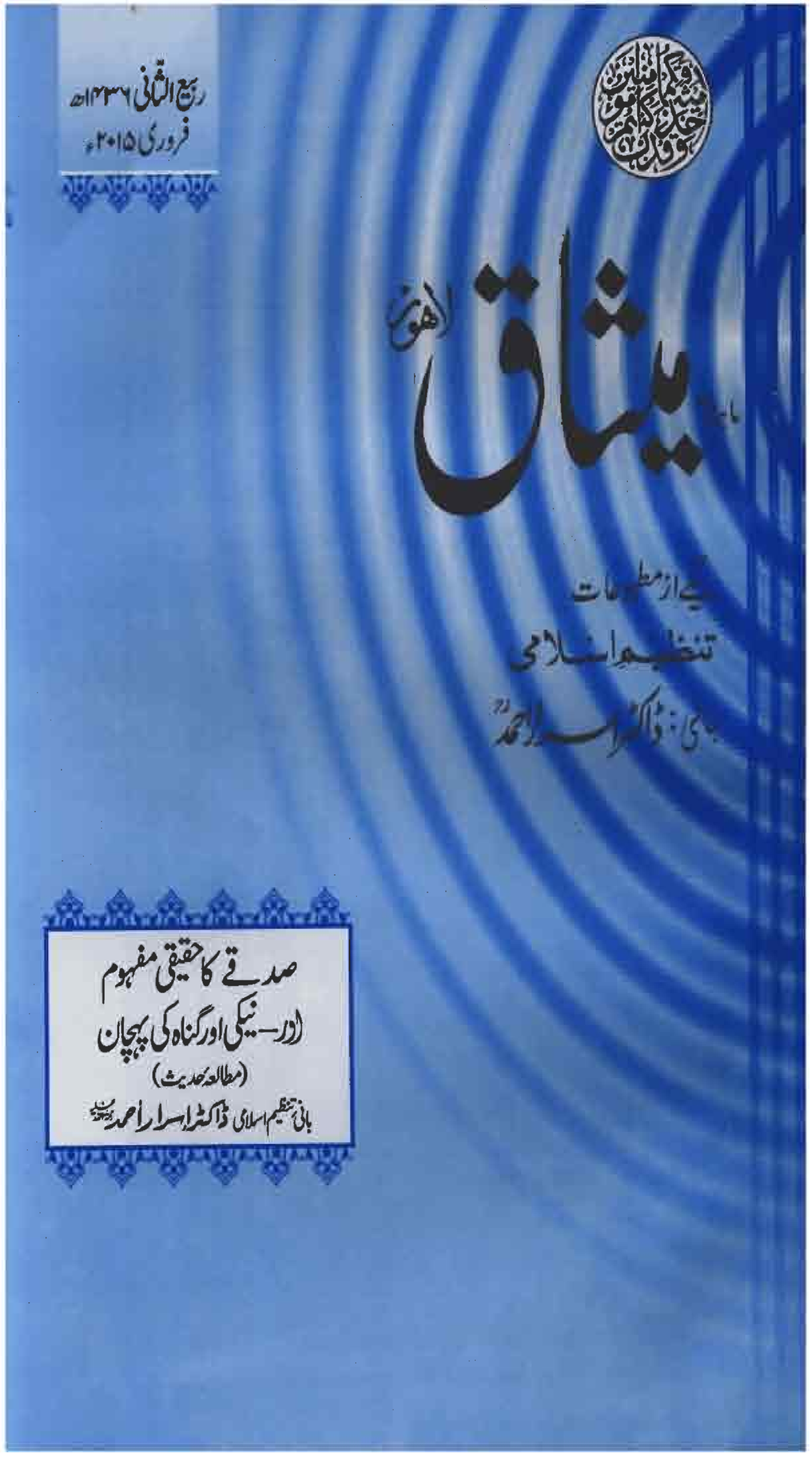

ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
فروری ۲۰۱۵ء

ماہنامہ

میثاق
لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

صدقے کا حقیقی مفہوم
اور — نیکی اور گناہ کی پہچان
(مطالعۂ حدیث)
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیمِ اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اوّل: سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم: سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم: سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم: سورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم: سُورۃُ مَریم تا سُورۃُ السّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم: سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
18-A ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 64

شمارہ : 2

ربیع الثانی 1436ھ

فروری 2015ء

فی شمارہ 30/-

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5

  گستاخانہ خاکوں کی اشاعت:
  مغرب کی ڈھٹائی — اُمت مسلمہ کی رسوائی — حافظ عاکف سعید

- **بیانُ القرآن** — 13

  سورۃ مریم (آیات ۵۱ تا ۹۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- **مطالعہ حدیث** — 31

  صدقے کا حقیقی مفہوم اور نیکی اور گناہ کی پہچان — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- **منتخب نصاب ۲** — 51

  امراء کا اپنے رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اُسوۂ رسول ﷺ — انجینئر حافظ نوید احمد

- **خطوط و نکات** — 70

  ''بیان القرآن'' — اِک شمع نور — قارئین میثاق

- **حقیقتِ دین** — 73

  اَللّٰہُ الصَّمَد — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

- **این چہ بو العجبی است!** — 77

  پاکستان میں نصاب سازی؟
  ''سچل سرمست'' کی ایک نظم کا تجزیہ — پروفیسر عبداللہ شاہین

- **اصلاحِ معاشرہ** — 85

  مرد کی دوسری شادی — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

- **بحث و نظر** — 95

  ذوالقرنین، سدِّ ذُوالقرنین اور یاجوج ماجوج (۶) — شاہین عطر جنجوعہ

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

گستاخانہ خاکوں کی اشاعت:

مغرب کی ڈھٹائی ـــــ اُمتِ مُسلمہ کی رسوائی

پیش نظر تحریر کا تعلق ''پیرس واقعہ'' سے ہے۔اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے (نومبر ۲۰۱۱ء اور ستمبر ۲۰۱۲ء میں) فرانس کے اخبار ''چارلی ہیبڈو'' نے نبی اکرم ﷺ کے خاکے شائع کیے تھے جو انتہائی توہین آمیز اور ہتک آمیز تھے۔ یہ سلسلہ یہاں رکا نہیں' بلکہ اس کے بعد دنیا کے بہت سے دوسرے اخبارات اور جرائد نے بھی ان خاکوں کو شائع کر دیا۔ یہ واقعات پوری اُمت مسلمہ کی شدید ترین دل آزادی کا باعث بنے۔ ۸ جنوری کو مذکورہ اخبار کی ایڈیٹوریل باڈی کی میٹنگ جاری تھی کہ اِس دوران ان لوگوں پر حملہ ہوا اور چیف ایڈیٹر سمیت اس جریدے کے ۱۲ مرکزی افراد ہلاک ہو گئے۔ان میں خاکے بنانے والا بدبخت کارٹونسٹ بھی شامل تھا' جسے بدترین خلائق ہی کہا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے اس حملے کا یہ پہلو تو یقیناً باعث اطمینان ہے کہ وہ لعین شخص بھی کیفر کردار کو پہنچ گیا۔تاہم یہ بات نہایت تکلیف دہ ہے کہ مذہبی رواداری اور برداشت کا درس دینے والے اہلِ مغرب توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے دفاع میں متحد ہو کر میدان میں آ گئے۔ دیکھا جائے تو مغرب میں جنونیوں کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کے ناموس پر رکیک حملوں کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے۔آج سے غالباً ۲۵ سال پہلے ملعون سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کی تھیں۔ وہ اس جسارت پر عالمِ کفر بالخصوص یہودیت' نصرانیت' ہندومت اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والوں کی آنکھوں کا تارا اور ہیرو بن گیا۔ایران کے رہبر آیت اللہ خمینی نے اس بدبخت کو کیفر کردار تک پہنچانے والے کے لیے ایک بڑے انعام کا اعلان کیا تھا' مگر انتہائی افسوس کی بات ہے کہ وہ شخص آج بھی دندناتا پھر رہا ہے۔اسی طرح بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین نے بھی گستاخانہ حرکتیں کی تھیں۔ اہلِ مغرب نے اُسے بھی تحفظ دیا۔ ہمارے لیے یہ بات شدید بے چینی کی ہے کہ پونے دو ارب مسلمان

آج تک اس کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے۔اب یہ ایک شخص نشانے پر آیا ہے' جس نے توہین کی انتہا کر دی تھی اور وہ نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کے حوالے سے آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا' تو یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اُس لعین کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے ردعمل میں پورے یورپ بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ پیرس میں تو اس واقعہ کے خلاف آناً فاناً ایک ملین مارچ ہو گیا' جس میں ۴۰ سربراہانِ مملکت بھی شریک ہوئے۔ بظاہر اس وقت یورپ کے اندر وہی نقشہ نظر آ رہا ہے جو صلیبی جنگوں کے وقت تھا۔ اُس دور میں صلیبی جنگوں کے لیے جانے والے نوجوانوں کا بڑا اعزاز و اکرام ہوتا تھا اور انہیں بڑے اہتمام سے رخصت کیا جاتا تھا۔آج پھر یورپ میں وہی سماں ہے۔

اس واقعہ کے ضمن میں ہم پر الزام یہ لگایا جا رہا ہے کہ مسلمان اُجڈ' غیر مہذّب اور جذباتی ہیں اور یہ واقعہ اظہارِ آزادیٔ رائے کی سنگین خلاف ورزی ہے' بایں طور کہ ایک شخص نے خاکوں کی شکل میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا' لیکن مسلمانوں سے ضبط نہیں ہوا۔ یوں مسلمانوں کو پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک خطرہ قرار دے کر یہ فضا بنائی جا رہی ہے کہ اگر انسانیت کو بچانا ہے تو مسلمانوں کا صفایا کرنا پڑے گا۔

اس ضمن میں ایک اصولی بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توہین اتنا بڑا ظلم اور اس قدر سنگین جرم ہے کہ کوئی بھی مسلمان اِسے کسی طور برداشت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہر شخص کو آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق حاصل ہے' لیکن یہ حق ہرگز لامحدود نہیں ہے۔اہلِ مغرب نے خود بہت سے معاملات میں آزادیٔ اظہارِ رائے پر قدغن لگائی ہوئی ہے۔ مثلاً بہت سے یورپی ممالک نے قانون بنایا ہوا ہے کہ ''ہولوکاسٹ'' کے بارے میں یہودیوں کے اختیار کردہ موقف سے سرمو ہٹ کر زبان کھولنا جرم عظیم ہے۔اسی طرح چند سال پہلے وہاں کی عدالت نے ایک ایسے اشتہار پر پابندی لگائی تھی جس میں ایک ماڈل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آخری کھانے کی نقالی کر رہا ہوتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں عدالت نے ایک ادارے کو اس لیے سزا سنائی کہ اس نے ایڈز کی روک تھام کے لیے ایک تقریب منعقد کی جس کے معلوماتی کتابچہ پر ایک عیسائی راہبہ کی تصویر ایک خاص انداز سے دی گئی تھی۔اسی طرح ۱۹۹۴ء میں فرانس کی عدالت نے ایک اخبار کو پوپ اور کیتھولک نظریات پر کاربند ریاستوں کے خلاف مضمون شائع کرنے پر مجرم قرار دیا۔خود ''چارلی ہیبڈو'' جس نے یہ گستاخانہ جسارت کی ہے' نے ایک کارٹونسٹ کو صدر سرکوزی کی بیوی

کے قابلِ اعتراض کارٹون بنانے پر نہ صرف نوکری سے نکال دیا تھا' بلکہ اس جریدے نے سرکوزی سے معافی بھی مانگی تھی۔ اس طرح اور بھی کئی واقعات ہیں جن سے آزادیٔ اظہارِ رائے کی تحدید ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہاں بھی اظہارِ رائے کی آزادی مطلق نہیں ہے' جس کی آڑ میں آنحضورﷺ کے خاکے بنانے والوں کا دفاع کرنے والے خود کو ہر قید اور تحدید سے آزاد سمجھتے ہیں۔

اصل جاننے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آنحضورﷺ کا مقام و مرتبہ کیا ہے اور آپؐ کی گستاخی کتنا بڑا جرم ہے! اللہ تعالیٰ نے محمد عربیﷺ کو جو مقام دیا اس کی ایک جھلک سورۃ الحجرات کی آیات میں دکھائی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝۲﴾

''اے اہلِ ایمان! اپنی آوازیں پیغمبرﷺ کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو' (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔''

نبی آخر الزمانﷺ کی رفعتِ شان ہمارے وہم و خیال سے بھی ماورا ہے۔ آپؐ کے مقام و مرتبہ کو کما حقہ بیان کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

یعنی خواجۂ کائناتﷺ کے مقام و مرتبہ کا بیان ہم نے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا ہے' اس لیے کہ وہی ایک ذاتِ پاک ہے کہ جو آپﷺ کے مقام و مرتبہ سے واقعی آگاہ ہے۔ مقامِ محمدیﷺ کے بارے میں شیخ سعدی کی بہت پیاری رباعی ہے:

یَا صاحبَ الجمال ویا سَیّدَ البشر
مِن وجهِكَ المُنیرِ لقد نوَّر القمر
لا یمکن الثّناءُ کما کان حَقُّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

رسول اللہﷺ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''ربّ

العالمین'' نے آپؐ کو ''رحمۃٌ للعالمینؐ'' کا لقب عطا کیا ہے' جس سے اونچا کوئی خطاب اور لقب ہو ہی نہیں سکتا۔ عالمین سے تمام جہان مراد ہیں' یعنی عالمِ دنیا' عالمِ آخرت' عالمِ انسانیت' عالمِ نباتات' عالمِ جمادات' عالمِ حیوانات' عالمِ جنّات' عالمِ ملائکہ وغیرہ۔ آپﷺ ان تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ کسی اور کو یہ مقام تو کجا اس کے آس پاس کا مقام بھی نہیں ملا۔

رسول اللہﷺ کے مقام و مرتبہ کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ آپ ''محبوبِ ربّ العالمینؐ'' ہیں' جو بہت اعلیٰ مقام ہے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۳۱) ''(اے پیغمبرﷺ! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو تم میری پیروی کرو' پھر اللہ بھی تم سے محبت کرے گا''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اصل محبوب محمد عربیﷺ ہیں اور آپؐ کے اتباع سے ہی آدمی کو اللہ کی محبوبیت کا مقام حاصل ہو گا۔ چنانچہ ''محبوبِ ربّ العالمینﷺ'' کی ناموس اور عزت کی حفاظت کے لیے کٹ مرنا ہمارے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ آپﷺ کی ناموس پر حملہ کرنے والا اسلام ہی نہیں' پوری انسانیت کے نام پر سیاہ ترین دھبے کی حیثیت رکھتا ہے' اور ایک مسلمان دھرتی کے سینے پر ایسے شخص کا ناپاک وجود ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ ظفر علی خان نے بڑی خوبصورتی سے اس بات کو بیان کیا ؎

زکوٰۃ اچھی' حج اچھا' روزہ اچھا' اور نماز اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا!
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثربؐ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا!

اِس امر میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ آپﷺ کے توہین آمیز خاکے بنانے والے اور قرآن مجید جیسی مقدس کتاب کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنے والے یہود و نصاریٰ' یہ گھٹیا حرکات غفلت و نادانی میں نہیں کر رہے ہیں' بلکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور محمدﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ مگر وہ جانتے بوجھتے ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ یہ سب کچھ ہو کیوں رہا ہے؟ معاذ اللہ! کیا اللہ تعالیٰ بے بس ہو گیا ہے؟ کیا ابلیسی قوتیں مسلمانوں پر غالب آ گئی ہیں اور کائنات کا کنٹرول بھی ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے؟ اور ہم اتنے ناتواں ہیں کہ اُن کا کچھ بھی نہیں کر سکتے؟ اس میں سمجھنے کی بہت سی باتیں ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ کو کوئی بھی گھٹا نہیں سکتا۔ اگر کوئی بدبخت ایسی مذموم حرکت کر رہا ہے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے چاند کی طرف منہ کر کے تھوکنا۔ اور چاند پر تھوکا اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔ حقیقت میں ایسا شخص اپنے آپ کو ہی ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ صہیونی و صلیبی اپنی گھٹیا حرکات اور گھناؤنی جسارتوں سے آپ ﷺ کے مرتبے میں کمی نہیں لا سکتے' البتہ اُن کی ان کارروائیوں سے اس امت کی رسوائی ضرور ہو رہی ہے۔

دراصل اعدائے اسلام تحدّی کے سے انداز میں ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو ہم تمہاری محبوب ترین اور مقدس ترین ہستیوں کے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو بیان کے قابل نہیں ہے' پھر بھی تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' اور آج تمہارا خدا بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ تم جتنا زیادہ احتجاج کرو گے' ہم اُسی قدر جسارتیں کریں گے۔ تو یہ ذلت و رسوائی اصل میں ہماری ہے۔

دراصل ہماری ہیبت دشمن کے دلوں سے نکل گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہماری اس حالت کی پیشین گوئی فرما دی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ایک وقت آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی' بالکل اُسی طرح جیسے دسترخوان پر کھانا چننے کے بعد مہمانوں سے کہا جاتا ہے کہ آیئے' تناول فرمایئے! اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیران ہو کر پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم اُس وقت تعداد میں بہت کم ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہو گی (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی ہو گی کہ مسلمان دنیا میں پونے دو ارب ہوں گے' اس لیے کہ دورِ صحابہ میں تو مسلمانوں کی گنتی لاکھ پر ختم ہو جاتی تھی) لیکن تمہاری حیثیت جھاگ کی سی ہو گی جیسے سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ تمہاری ہیبت تمہارے دشمنوں کے دلوں سے نکال لے گا اور خود تمہارے دلوں میں وَھْن کی بیماری ڈال دے گا۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!'' (سنن ابی داؤد)

اس وقت بعینہٖ ہماری یہی کیفیت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کی حیثیت سے ہماری یہ ذمہ داری تھی اور ہے کہ دین حق کے غلبہ کے لیے جدّ و جہد کریں۔ ہم نے اِس ذمہ داری کو فراموش کر دیا تو دنیا پرستی نے ہمیں گھیر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم موت کے تصور سے بھی ڈر رہے ہیں۔ ہماری ذلت و رسوائی کی وجہ ہماری اپنی بداعمالیاں ہیں۔ ہم سے پہلے زمین پر اللہ تعالیٰ کی نمائندہ امت بنی اسرائیل تھی' مگر جب انہوں نے صحیح نمائندگی نہ کی اور اللہ کے

دین سے بے وفائی کی تو اللہ نے ان پر ذلت و مسکنت کا عذاب مسلط کر دیا۔ آج ہم مسلمان اس عذاب کا شکار ہیں۔ مغربی اقوام کی ان گھناؤنی جسارتوں سے دراصل ہماری ذلت و رسوائی ہو رہی ہے۔ ورنہ ہم تو اُس امت کا حصہ ہیں کہ جن کی ہیبت سے کافر تھر تھر کانپتے تھے۔

پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی کا واقعہ ہے۔ بنو اُمیہ کے دورِ خلافت میں دیبل (موجودہ کراچی) کی بندرگاہ پر سمندری لٹیروں نے مسلمانوں کے ایک تجارتی جہاز کو لوٹ لیا اور ایک مسلمان لڑکی کی حرمت کو پامال کیا۔ اس لڑکی نے جہاز کے دہانے پر کھڑے ہو کر کہا: ''کہاں ہے خلیفہ؟'' مظلوم خاتون کی فریاد جیسے ہی دربار تک پہنچی' تو خلیفہ نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں لشکر تیار کر کے سندھ بھیجا اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ ہائے یہ کیسا انقلابِ حال ہے کہ ایک عورت کی بے حرمتی پر مجرموں کو سبق سکھا دینے والی اُمت آج بے بسی کی تصویر بنی ہے۔ آج ناموسِ رسالت کو پامال کیا جا رہا ہے' یہود و نصاریٰ کی طرف سے آنحضور ﷺ کے کارٹون بنانے کے لیے مقابلہ کا اعلان کیا گیا' قرآن مجید کو علانیہ جلا کر اُمت کی غیرتِ دینی کو للکارا گیا کہ ہم تمہارے ساتھ یہ کر رہے ہیں' ان جسارتوں کو روک سکتے ہو تو روک لو! پھر امریکہ کے ائیر بیسوں اور عقوبت خانوں میں مسلمانوں کو ذہنی کوفت پہنچانے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ بیان کے قابل نہیں۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ دراصل ہم اللہ تعالیٰ سے بے وفائی اور اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آج بے یار و مددگار ہیں۔

مغرب کی اِن شنیع حرکات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معرکہ حق و باطل جو ازل سے جاری ہے' اب اس کا فائنل راؤنڈ آن پہنچا ہے۔ آج جبکہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے' حزب اللہ اور حزب الشیطان کی تقسیم بالکل واضح طور پر سامنے آ گئی ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

یہ خاکے بنانے والے اور نائن الیون کے بعد مسلم دنیا پر چڑھائی کرنے والے دراصل تہذیب حاضر کے درندے ہیں' جو دنیا سے صداقت کا ہر نقش مٹا دینا چاہتے ہیں' اسلام کے نور کو بجھا دینا

چاہتے ہیں۔ ابلیس کے چیلے چانٹے اگرچہ انسانی تاریخ میں ہر دور میں ہوتے رہے‘ لیکن آج کے دور کی اضافی بات یہ ہے کہ ساری سائنسی ٹیکنالوجی ابلیس کے کارندوں کے ہاتھ میں ہے‘ اور بدقسمتی سے ان میں سب سے نمایاں یہود و نصاریٰ ہیں۔ وہ سو فیصد شیطان کے چیلے ہیں اور ٹیکنالوجی کی قوت کو ابلیسی نظام کے غلبہ کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ہم مسلمانوں نے اللہ کے دین سے بے وفائی کی ہے اور اس کا پورا فائدہ ابلیس نے اٹھایا ہے کہ آج پوری دنیا اُس کے شکنجے میں ہے۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت آج اس ابلیسی تہذیب کے سیلاب میں بہہ چکی ہے۔ دجالی تہذیب کے حوالے سے یہ وہی بات ہے جس کی خبر آنحضورﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی کہ دجال کے ایک ہاتھ میں آگ (دوزخ) ہوگی اور ایک ہاتھ میں پانی (جنت)‘ اور جو شخص اس کے پانی کو اختیار کرے گا تو وہ جہنم میں جائے گا‘ اور جو اس کے دباؤ میں نہ آتے ہوئے آگ کو قبول کرے گا تو وہ اصل میں جنت والا ہے۔ یہ بڑی واضح باتیں ہیں اور آج ہمیں وہی مرحلہ درپیش ہے۔

اس بدترین صورتِ حال میں ہمارے لیے ایک خوشخبری بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں میں بیداری بھی شروع ہوگئی ہے۔ دو عشرے پہلے افغانستان میں اللہ کے سچے وفاداروں نے نظامِ الٰہی اور شریعتِ محمدیؐ کو نافذ کر کے دنیا کو دکھایا تھا۔ اس کی برکات کو دیکھتے ہوئے ابلیسی قوتوں نے اپنے نظام کو بچانے کے لیے نائن الیون کا ڈراما رچایا اور شریعت محمدیؐ کے خاتمے کے لیے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے وفاداروں کا ساتھ دیا اور آج ابلیسی قوتیں اپنی ساری مشینری اور ساری ٹیکنالوجی کے باوجود شکست کا داغ لیے رسوا کن انداز میں واپس جا رہی ہیں۔ اللہ کے سچے وفادار اگرچہ ابھی کم ہیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا اور آہستہ آہستہ یہ صورت آگے بڑھے گی اور بالآخر کُل روئے ارضی پر اللہ کا دین قائم ہو کر رہے گا‘ جس کی پیشین گوئی نبی آخر الزماںﷺ نے فرمائی ہے۔ اگرچہ بظاہر امت کے حالات کی تصویر بہت مخدوش ہے‘ تاہم بالآخر خلافت کا عالمی غلبہ ہو کر رہے گا۔ حالات اُسی طرف جا رہے ہیں اور اس کا آغاز افغانستان سے ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امریکہ کے آگے کوئی ٹھہر بھی سکتا ہے۔ ہم ایٹمی قوت ہونے کے باوجود امریکہ کے آگے بچھ گئے تھے‘ مگر طالبان مجاہدین نے امریکہ کے خلاف شاندار مزاحمت کی تاریخ رقم کر دی۔

نائن الیون کے بارے میں ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں کہ اس میں امریکہ اور اسرائیلی

ایجنسیاں شامل تھیں۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ ان کا اپنا رچایا ہوا ڈراما تھا‘ لیکن کچھ مسلمانوں کو انہوں نے فرنٹ پر رکھا جو امریکہ اور اسرائیل کے خلاف شدید جذبات رکھتے تھے۔ اب پیرس واقعہ کے بارے میں بھی کہا جا رہا ہے کہ اس میں بھی مسلمانوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح اس واقعہ کے فوراً بعد ۴۰ یورپی ممالک کے حکمران میدان میں آ گئے اور ایک ملین مارچ ہو گیا اُس سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ بھی نائن الیون کی طرح کی کارروائی ہے۔ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ابلیسی قوتوں کا مشن ہے اور اب یہ تحریک شروع ہو گئی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں چونکہ خلافت کی بات ہو رہی ہے جس سے ایک مرتبہ پھر امریکہ‘ بلکہ حقیقت میں ابلیس کے لیے خطرہ پیدا ہو رہا ہے‘ لہٰذا ممکن ہے کہ افغانستان میں ناکامی کے بعد اب پیرس کا یہ منصوبہ بنایا گیا ہو‘ کیونکہ دشمن یہی چاہتے ہیں کہ ایک بار پھر پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کر کے ان کو کچل کے رکھ دیا جائے۔ وہ مسلمانوں کو خطہ ارضی سے مٹانے کے لیے اپنی سی ساری کوششیں کریں گے‘ لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں بیداری کی لہر بھی پیدا ہو گئی ہے اور یہ ان شاء اللہ آگے بڑھے گی۔ اب حق و باطل کے درمیان فائنل راؤنڈ آ گیا ہے اور ہم اس راؤنڈ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی اور اس بات کی ہمیں شعوری کوشش بھی کرنی ہوگی کہ ہم حزب اللہ کے ساتھ جڑے رہیں اور حزب الشیطان کا حصہ نہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حزب اللہ کا ساتھ دینے اور حزب الشیطان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

☆☆☆

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ مَریَم

آیات ۵۱ تا ۶۳

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۫ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝ جَنّٰتِ عَدْنِ ۨ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝

آیت ۵۱ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۱﴾

''اور کتاب میں تذکرہ کیجیے موسیٰؑ کا' یقیناً وہ تھے خاص کیے گئے اور وہ تھے رسول نبی۔''

ہم نے انہیں خاص اپنا بنالیا تھا۔ یہ مضمون سورۂ طٰہٰ (آیت ۴۱) میں بھی آئے گا۔

آیت ۵۲ ﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝۵۲﴾ ''اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے اور انہیں اپنے قریب کیا سرگوشی کے لیے۔''

آیت ۵۳ ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝۵۳﴾ ''اور ہم نے انہیں عطا کیا اپنی رحمت سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے درخواست کی تھی کہ انہیں بھی میرے ساتھ بھیجا جائے۔ اللہ نے اپنی رحمت سے آپؑ کی یہ درخواست قبول فرماتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بھی مقامِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اس کی تفصیل بھی سورۂ طٰہٰ میں آئے گی۔

آیت ۵۴ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ ''اور تذکرہ کیجیے اس کتاب میں اسماعیلؑ کا (بھی) 'یقیناً وہ وعدے کے سچے تھے''

یہ خصوصی طور پر اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو آپؑ نے اپنے والد ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان الفاظ میں کیا تھا: ﴿يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲﴾ (الصّٰفّٰت) ''ابا جان آپ کر گزریے جو آپؑ کو حکم ہوا ہے' مجھے آپ ان شاء اللہ صابرین میں سے پائیں گے''۔ یوں آپؑ نے ذبح ہونے کے لیے اپنی گردن پیش کر دی اور اس سلسلے میں صبر کرنے کا جو وعدہ کیا تھا آخر وقت تک اسے نبھایا۔

﴿وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۴﴾ ''اور وہ (بھی) رسول نبی تھے۔''

جیسا کہ ''رسول نبی'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے قبل ازیں وضاحت کی جا چکی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام مزاج کے اعتبار سے بہت متحرک اور فعال تھے اس لیے آپؑ کو رَسُولاً نَبِیًّا کا لقب عطا ہوا ہے۔ اس ضمن میں اس سے قبل حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزاج کی بھی مثال دی گئی ہے۔ حضرت حمزہؓ حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے بھی تھے اور آپؓ کی شخصیت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شخصیت سے بہت مشابہت بھی رکھتی تھی۔

آیت ۵۵ ﴿وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝۵۵﴾

''اور وہ حکم دیتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا' اور وہ اپنے رب کے نزدیک

پسندیدہ تھے۔‘‘

آپؑ اللہ تعالیٰ کے بہت منظورِ نظر تھے۔

آیت ۵۶ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ﴾ ’’اور تذکرہ کیجیے کتاب میں ادریسؑ کا (بھی)‘‘

حضرت ادریس علیہ السلام‘ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اور حضرت نوح علیہ السلام سے قبل زمانے میں مبعوث ہوئے۔ ان سے پہلے ذریتِ آدمؑ میں حضرت شیث علیہ السلام گزر چکے تھے۔ تورات میں ان کا نام ’’حنوک‘‘ مذکور ہے۔ ان کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ حضرت ادریس اور حضرت شیث علیہما السلام دونوں نبی تھے‘ جبکہ ان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول کے طور پر مبعوث ہوئے۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۵۶﴾ ’’یقیناً وہ صدّیق نبی تھے۔‘‘

اس سے پہلے آیت ۴۱ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ’’صِدِّيْقًا نَّبِيًّا‘‘ کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ یعنی مزاج کے اعتبار سے حضرت ادریس علیہ السلام کی مناسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ دونوں شخصیات صدیقیت کے مزاج کی حامل تھیں۔

آیت ۵۷ ﴿وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝۵۷﴾ ’’اور ہم نے انہیں اٹھایا بلند مقام پر۔‘‘

اسرائیلی روایات کے زیر اثر بعض لوگوں نے اس سے رفع سماوی مراد لیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ اٹھا لیا تھا۔ معراج کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کی چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الفاظِ قرآنی بہت واضح ہیں: ﴿رَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ (آلِ عمران: ۵۵) کہ میں آپؑ کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ ان الفاظ سے رفعِ سماوی کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے‘ جبکہ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں آیت زیر نظر میں لفظ ’’رفع‘‘ کے ساتھ ’’اِلٰی‘‘ کی عدم موجودگی میں یہ مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہاں پر اس لفظ کا یہی مفہوم مراد لیا جا سکتا ہے کہ ہم نے انہیں بلند مقام عطا کیا۔

آیت ۵۸ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ﴾ ’’یہ ہیں وہ لوگ جن پر انعام فرمایا اللہ نے انبیاء میں سے‘‘

سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں مُنْعَمْ عَلَيْهِم لوگوں کے جن چار طبقات کا بیان ہے‘ ان

میں سے اعلیٰ ترین طبقہ کے افراد یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کا یہاں اللہ کے انعامات کے حوالے سے تذکرہ فرمایا جا رہا ہے۔

﴿مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۘ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ﴾ ’’اولادِ آدمؑ میں سے‘ اور ان لوگوں (کی نسل) میں سے جنہیں سوار کرایا ہم نے (کشتی میں) نوحؑ کے ساتھ‘‘

﴿وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ﴾ ’’اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی نسل میں سے‘ اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور جنہیں ہم نے چُن لیا۔‘‘

﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝۵۸﴾ ’’جب تلاوت کی جاتیں ان پر رحمٰن کی آیات تو وہ گر پڑتے تھے (اللہ کی جناب میں) سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔‘‘

آیت ۵۹ ﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾ ’’پھر جانشین ہوئے ان کے بعد ناخلف لوگ‘‘

’’خَلْف‘‘ کا لفظ جب ’’ل‘‘ ساکن کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ’’ناخلف‘‘ کے لیے جاتے ہیں۔ یعنی اپنے اسلاف کے کردار کے خلاف عمل کرنے والے اور ان کی نیک نامی اور بزرگی کو بٹّہ لگانے والے لوگ۔

﴿اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝۵۹﴾ ’’انہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کی پیروی کی‘ تو عنقریب وہ ملیں گے گمراہی سے۔‘‘

یعنی عنقریب وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

آیت ۶۰ ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۝۶۰﴾ ’’سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کی اور وہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے‘ تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن پر قطعاً کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

اُن کے اعمال کا انہیں پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان کی ذرہ بھر بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

آیت ۶۱ ﴿جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾ ’’(انہیں ملیں گے)

عیشِ دوام کے باغات‘ جن کا وعدہ کیا تھا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غیب میں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں ایسے وعدے جگہ جگہ کیے گئے ہیں۔ دُنیوی زندگی میں نہ تو کسی نے جنت کو دیکھا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو۔ یہ سارا معاملہ غیب ہی کا ہے۔ چنانچہ جو شخص اللہ کو اور اس کے ایسے تمام وعدوں کو مانتا ہے وہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے مصداق غیب پر ایمان لاتا ہے۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ۝۶۱﴾ ’’یقیناً اس کا وعدہ تو پورا ہونے والا ہی ہے۔‘‘

وہ اپنے وقت پر پورا ہو کر رہے گا۔

آیت ۶۲ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ﴾ ’’وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغو بات مگر صرف سلام۔‘‘

جنت میں ہر طرف سے سلام سلام کی آوازیں آ رہی ہوں گی۔ ہر طرف سے فرشتوں کا ورود ہو گا اور وہ اہل جنت کو سلام کہہ رہے ہوں گے۔ سورۃ الواقعہ میں اس مضمون کو ایسے بیان فرمایا گیا ہے: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝۲۵ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝۲۶﴾ ’’وہ اس میں کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے‘ مگر ایک ہی بات: سلام! سلام!‘‘

﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝۶۲﴾ ’’اور ان کے لیے ان کا رزق ہو گا اس میں صبح اور شام۔‘‘

آیت ۶۳ ﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝۶۳﴾ ’’یہ ہے وہ جنّت جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں میں سے اُن کو جو متقی ہوں گے۔‘‘

آیات ۶۴ تا ۸۲

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝۶۴ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ
وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝۶۵ وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ
لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝۶۶ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ
شَيْـًٔا ۝۶۷ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝۶۸

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝۶۹ ثُمَّ لَنَحْنُ
اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۝۷۰ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ
حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝۷۱ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝۷۲ وَاِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ
مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝۷۳ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا
وَّرِءْيًا ۝۷۴ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا
مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا
وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ۝۷۵ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝۷۶ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ
لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝۷۷ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝۷۸ كَلَّا ؕ
سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝۷۹ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا
فَرْدًا ۝۸۰ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝۸۱ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ
بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝۸۲

آیت ۶۴ ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم (فرشتے) نہیں نازل ہوتے مگر آپ کے رب کے حکم سے۔‘‘

یہاں سے ایک بہت اہم مضمون کا آغاز ہو رہا ہے اور یہ بات اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی‘ جو عشق تھا‘ اس کا جو شغف اور شوق تھا‘ اس کی بنا پر وحی میں وقفہ آپ ﷺ پر بہت شاق گزرتا تھا۔ آپؐ کی خواہش ہوتی تھی کہ وحی جلد از جلد آتی رہے تاکہ اس سے آپؐ اپنے وجودِ پُرنور کو مزید منور کرتے رہیں۔ اس حوالے سے آپؐ نے جبرائیل علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ آپ کی آمد وقفے وقفے سے ہوتی ہے‘ ہم انتظار کرتے رہتے ہیں۔ آپ ﷺ کے اس شکوہ کا یہاں جبرائیل کی طرف سے جواب دیا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ ہم اپنی مرضی سے نازل نہیں ہوتے‘ ہم تو آپ کے رب کے حکم کے پابند ہیں۔ اُس کا اِذن ہوتا ہے تو ہم نازل ہوتے ہیں۔

﴿لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ﴾ ’’اُسی کے اختیار میں ہے جو

ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے۔‘‘

ان الفاظ میں بہت گہرائی ہے۔ آگے اور پیچھے کے درمیان میں کون ہے؟ وہی جو یہاں متکلم ہیں‘ یعنی خود جبرائیل! مراد یہ کہ میں بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوں اور فرشتے کی یہی شان ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرِمُو سرتابی نہیں کرتے‘ جیسا کہ سورۃ التحریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝۶﴾ ’’وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جس کا وہ انہیں حکم دے‘ اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔‘‘

﴿وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا ۝۶۴﴾ ’’اور آپؐ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔‘‘

اے نبی ﷺ! ہم آپ کے رب کی اجازت اور مشیت سے وحی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ اس میں جو تاخیر ہوتی ہے وہ کسی نسیان کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اُس کی مرضی اور حکمت سے ہوتی ہے۔ سورۃ الفرقان میں اس حکمت کی وضاحت ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے: ﴿کَذٰلِکَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰہُ تَرْتِیْلًا ۝۳۲﴾ ’’اسی طرح (ہم نے اسے نازل کیا) تاکہ مضبوط کر دیں اس کے ساتھ آپؐ کا دل اور (اسی لیے) ہم نے اسے پڑھ کر سنایا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے‘‘۔ اور سورۂ بنی اسرائیل میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے: ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰہُ لِتَقْرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّنَزَّلْنٰہُ تَنْزِیْلًا ۝۱۰۶﴾ ’’اور قرآن کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے (کر کے نازل) کیا ہے‘ تاکہ آپؐ اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائیں ٹھہر ٹھہر کر‘ اور ہم نے اس کو اتارا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے۔‘‘

آیت ۶۵ ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ؕ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ۝۶۵﴾ ’’وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اس کا جو ان دونوں کے مابین ہے‘ پس آپؐ اسی کی عبادت کریں اور جمے رہیں اس کی عبادت پر۔ کیا آپ جانتے ہیں کوئی اس کا ہم نام؟‘‘

ظاہر ہے جو اللہ کی صفات ہیں‘ جو اس کی شان ہے‘ ایسی صفات اور ایسی شان رکھنے والی کوئی ہستی کائنات میں موجود نہیں۔

آیت ۶۶ ﴿وَیَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا ۝۶۶﴾ ’’اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو پھر مجھے زندہ کر کے نکال لیا جائے گا؟

یہ ان لوگوں کا قول نقل ہوا ہے جو بعث بعد الموت کے منکر تھے۔ مشرکین مکہ کے عقائد

کے بارے میں پہلے بھی کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر آخرت کے قائل تھے‘ اسی لیے تو بتوں کے بارے میں ان کے اس عقیدے کا قرآن میں ذکر ہوا ہے: ﴿وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ ؕ﴾ (یونس:۱۸) ’’اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہوں گے۔‘‘

آیت ۶۷ ﴿اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَکُ شَیْئًا ۝۶۷﴾ ’’کیا انسان یہ بات یاد نہیں کرتا کہ ہم نے ہی اسے پیدا کیا تھا اس سے پہلے جبکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا!‘‘

آج جو انسان حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بھلا مر جانے کے بعد میں پھر سے کیسے زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جاؤں گا‘ کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اسے اس وقت ایک انسان کی صورت میں پیدا کیا تھا جب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تو اب اللہ کے لیے اسے دوبارہ زندہ کر دینا کیونکر مشکل ہوگا؟

آیت ۶۸ ﴿فَوَرَبِّکَ لَنَحْشُرَنَّھُمْ وَالشَّیٰطِیْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّھُمْ حَوْلَ جَھَنَّمَ جِثِیًّا ۝۶۸﴾ ’’تو آپؐ کے ربّ کی قسم! ہم ضرور جمع کریں گے انہیں اور تمام شیطانوں کو بھی‘ پھر ہم ضرور حاضر کریں گے انہیں جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل گرے ہوئے۔‘‘

آیت ۶۹ ﴿ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ کُلِّ شِیْعَۃٍ اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا ۝۶۹﴾ ’’پھر ہم ضرور چھانٹ کر نکال لیں گے ہر گروہ میں سے ہر اس شخص کو جو اُن میں سب سے زیادہ سخت تھا رحمٰن کے خلاف سرکشی میں۔‘‘

اس اجتماع میں سے ہر ہر گروہ کے ایسے سرکردہ لیڈروں کو چُن چُن کر علیحدہ کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے معاملے میں زیادہ اکڑنے والے تھے اور اس کے مقابلے میں سرکشی اور گستاخی میں پیش پیش رہتے تھے۔ چنانچہ ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط جیسے بڑے بڑے مجرموں کو چھانٹ کر الگ کر لیا جائے گا۔

آیت ۷۰ ﴿ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ ھُمْ اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا ۝۷۰﴾ ’’پھر ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو اس میں پہلے داخل ہونے کے لائق ہوں گے۔‘‘

آیت ۷۱ ﴿وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا ۚ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ۝۷۱﴾ ’’اور تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس پر وارد نہ ہو۔ یہ آپ کے رب کا حتمی فیصلہ ہے۔‘‘

اس آیت کا جو مفہوم عام طور پر سمجھا گیا ہے مجھے اس سے اتفاق ہے اور وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے تمام افراد کو جہنم کے اوپر ''پل صراط'' پر سے گزرنا ہوگا۔ گویا یہ وہی ''الصراط'' ہوگا جسے ''صراطِ مستقیم'' کہا گیا ہے' جس پر گامزن ہونے کے ہم دعوے دار ہیں۔ یہی صراطِ مستقیم قیامت کے دن ''پل صراط'' بن جائے گا۔ اہل جنت اُس روشنی میں چلتے ہوئے جو انہیں عطا کی جائے گی بڑی سرعت اور آسانی کے ساتھ پل صراط کو پار کر کے جنت میں داخل ہو جائیں گے' جبکہ اہل جہنم اندھیرے میں ٹھوکریں کھا کھا کر نیچے آگ میں گرتے جائیں گے۔ یہ مضمون سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم کے مطالعے کے دوران زیادہ وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔ بہر حال آیت زیر نظر کے مطابق ہر انسان کو اس طریقے سے جہنم پر سے گزرنا ہوگا۔ اہل جنت کو اس پر سے گزارنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے جہنم کا مشاہدہ کر لیں اور انہیں اندازہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی مغفرت کر کے انہیں کس ہولناک انجام سے بچایا ہے۔

آیت ۷۲ ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝۷۲﴾ ''پھر ہم بچا لے جائیں گے انہیں جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی اور چھوڑ دیں گے ظالموں کو اسی میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے۔''

یعنی اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ پُل پر سے گزرتے جائیں گے اور مجرم لوگ نیچے جہنم میں گرتے جائیں گے۔

آیت ۷۳ ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝۷۳﴾ ''اور جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری روشن آیات' تو یہ کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ (دیکھو!) دونوں گروہوں میں سے کس کا مقام بہتر ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے!''

کفارِ مکہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے تضحیک و استہزاء کے انداز میں سوال کرتے تھے کہ ذرا دیکھو تو سہی مجلسی شان و شوکت اور معاشرتی مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ہم دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ بہتر ہے۔ ایک طرف محمد (ﷺ) چند فقراء و مساکین کو لے کر بیٹھے ہیں تو دوسری طرف ابوجہل اور ولید بن مغیرہ کی چوپالوں میں امراء و رؤساء کی چہل پہل ہے۔ ان دونوں گروہوں کی حیثیت و اہمیت کا بھلا آپس میں کیا تقابل اور موازنہ! کہاں فرش خاک پر بیٹھے

بلال' خبّاب' ابوفکیہہ' عمار اور یاسر رضی اللہ عنہم جیسے مُفلس و قلاش اور غلام' اور کہاں شاہانہ محفلوں میں سردارانِ قریش کی سج دھج اور شان و شوکت! یہ وہی انداز ہے جو سورۃ الکہف میں دو افراد کے مکالمے کے دوران دیکھنے میں آتا ہے۔ وہاں بھی ایک دولت مند متکبر شخص نے اللہ کے بندے کو مخاطب کر کے بڑے طمطراق سے کہا تھا: ﴿اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝۳۴﴾ ''میں تم سے بہت زیادہ ہوں مال میں اور بہت بڑھا ہوا ہوں نفری میں!''

آیت ۷۴ ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ۝۷۴﴾ ''اور ہم کتنی ہی قوموں کو ان سے پہلے ہلاک کر چکے ہیں' جو ان سے کہیں بڑھ کر تھیں ساز و سامان اور شان و شوکت میں!''

قریش مکہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ اور قومِ شعیبؑ جو اپنے اپنے رسول کی دعوت کو ٹھکرا کر ہلاکت سے دوچار ہوئیں وہ دنیوی شان و شوکت اور مال و اسباب کے اعتبار سے ان سے کہیں بڑھ کر تھیں۔

آیت ۷۵ ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ اِن کو بتا دیجیے کہ جو کوئی گمراہی میں پڑ جاتا ہے تو رحمٰن اسے بہت زیادہ ڈھیل دے دیتا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ اور قانون ہے کہ جو شخص فہم و شعور کے باوجود گمراہی میں پڑنا پسند کر لیتا ہے تو وہ اس کی رسّی دراز کرتا ہے اور اسے دُنیوی نعمتوں سے نوازتا چلا جاتا ہے۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے جس کی انہیں وعید دی جا رہی ہے' خواہ عذاب ہو یا قیامت!''

﴿فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ۝۷۵﴾ ''تب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے مقام و مرتبہ میں بدتر اور (کون ہے) لاؤ لشکر کے اعتبار سے کمزور تر۔''

دُنیوی زندگی تو ایک سراب کی مانند ہے۔ یا اس کی مثال ایک سٹیج ڈرامے کی سی ہے جس میں مختلف کرداروں کے مختلف بہروپ نظر آتے ہیں۔ مگر جب آخرت میں حقیقت کھل کر سامنے آئے گی تب انہیں پتا چلے گا کہ اصل میں مقام و مرتبہ اور طاقت و قوت کے لحاظ سے کون بڑھ کر تھا؟ محمد ﷺ یا ابوجہل؟

آیت ۷۶ ﴿وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ﴾ ’’اور اللہ بڑھاتا ہے ان لوگوں کو ہدایت میں جنہوں نے ہدایت اختیار کی۔‘‘

﴿وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝۷۶﴾ ’’اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپؐ کے ربّ کے نزدیک بدلے کے اعتبار سے بھی اور بہتر ہیں انجام کے اعتبار سے بھی۔‘‘

یہ مال و دولتِ دنیا سب یہیں کی چیزیں ہیں اور یہیں رہ جائیں گی۔ بقا اور دوام اگر کسی چیز کو ہے تو وہ نیک اعمال ہیں۔ انسان کے ساتھ عالمِ آخرت میں بھی نیک اعمال ہی جائیں گے۔ یہ بدلے کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ بالآخر ہر کسی نے لوٹ کر اپنے انہی اعمال کے پاس ہی جانا ہے۔ جب کوئی نیک شخص جنت میں پہنچے گا تو اپنے نیک اعمال کو جنت کی نعمتوں کی شکل میں اپنا منتظر پائے گا۔ وہاں اسے بتایا جائے گا کہ یہ نعمتیں دراصل تمہارے وہ نیک اعمال ہیں جو تم نے دنیا میں سرانجام دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی سے انہوں نے جنت کی ان نعمتوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

آیت ۷۷ ﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝۷۷﴾ ’’کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات کا کفر کیا اور کہا کہ مجھے (آخرت میں بھی) مال اور اولاد سے لازماً نوازا جائے گا!‘‘

یہ بھی وہی مضمون ہے جو سورۃ الکہف کے پانچویں رکوع میں دو اشخاص کے مکالمے کے سلسلے میں گزر چکا ہے۔ وہاں بھی بالکل اسی سوچ کے حامل مالدار شخص کا ذکر ہے جس نے اللہ کے نیک بندے کو مخاطب کر کے کہا تھا: ﴿وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۶﴾ کہ میں تو نہیں سمجھتا کہ قیامت واقعی برپا ہوگی، لیکن بالفرض اگر ایسا ہوا بھی تو میں دنیا کی طرح وہاں بھی نوازا جاؤں گا اور تم جو یہاں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہو وہاں بھی اسی حال میں رہو گے۔

آیت زیرِ نظر میں یہی نظریہ قریش مکہ کے حوالے سے دہرایا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جو پُرتعیش زندگی کے مزے لے رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہم سے خوش ہے۔ چنانچہ ہمیں آخرت میں بھی اسی طرح سے کثرتِ مال و اولاد سے نوازا جائے گا۔ ان الفاظ کا

ایک مفہوم یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ اسی دنیا میں آئندہ بھی کثرتِ مال و اولاد کی توقع لیے بیٹھے تھے، مگر مجھے ان مفسرین کی رائے سے اتفاق ہے جن کے نزدیک یہ ان کی آخرت کی توقع کا ذکر ہے۔

آیت ۷۸ ﴿اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝۷۸﴾ ’’کیا وہ غیب پر مُطلع ہو چکا ہے؟ یا اُس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟‘‘

جو شخص ایسے دعوے کرتا ہے آخر اس کے ان دعووں کی دلیل کیا ہے؟ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے؟ یا اللہ تعالیٰ سے وہ کوئی قول و اقرار لے چکا ہے؟

آیت ۷۹ ﴿كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ﴾ ’’ہرگز نہیں! ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ وہ کہہ رہا ہے‘‘

ہم ایسے شخص کی ایک ایک بات کو لکھ کر محفوظ کر لیں گے تاکہ اس سے پوری طرح جوابدہی کی جا سکے۔

﴿وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝۷۹﴾ ’’اور اُس کے لیے عذاب کو ہم بڑھاتے چلے جائیں گے۔‘‘

آیت ۸۰ ﴿وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝۸۰﴾ ’’اور ہم وارث ہوں گے اُس سب کچھ کے جس کا وہ ذکر کر رہا ہے اور وہ آئے گا ہمارے پاس اکیلا ہی۔‘‘

اس کا دُنیوی مال و متاع تو سب ہماری وراثت میں آ جائے گا اور جب اسے ہماری عدالت میں پیش ہونے کے لیے لایا جائے گا تو وہ بالکل یکہ و تنہا ہوگا۔ مال و اولاد، خدم و حشم، قوم و قبیلہ، ہم مشرب و حاشیہ نشین وغیرہ میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔

آیت ۸۱ ﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝۸۱﴾ ’’اور انہوں نے بنا رکھے ہیں اللہ کے سوا دوسرے معبود تاکہ وہ ان کے لیے مددگار بنیں۔‘‘

ان کا خیال ہے کہ ان کے یہ معبودان کے لیے پشت پناہ ثابت ہوں گے اور انہیں اللہ کے عذاب سے چھڑا لیں گے۔

آیت ۸۲ ﴿كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ﴾ ’’ہرگز نہیں! وہ تو ان لوگوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے‘‘

یہ مضمون قرآن میں بار بار آیا ہے کہ وہ ہستیاں جنہیں یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے رہے ہوں گے‘ وہ فرشتے ہوں‘ اولیاء اللہ ہوں یا انبیاء ہوں‘ قیامت کے دن وہ سب ایسے مشرکین سے اظہارِ براءت کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم لوگ دنیا میں ہماری پرستش کرتے رہے ہو‘ ہم سے دعائیں مانگتے رہے ہو اور سمجھتے رہے ہو کہ ہم تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے چھڑا لیں گے!

﴿وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾﴾ ’’اور (وہاں) وہ ان لوگوں کے مخالف ہو جائیں گے۔‘‘

آیات ۸۳ تا ۹۸

ع اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع

آیت ۸۳ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾﴾ ’’کیا آپؐ نے دیکھا نہیں کہ ہم کافروں پر شیاطین کو بھیجتے رہتے ہیں اور وہ انہیں خوب خوب اُکساتے ہیں!‘‘

چونکہ ایسے لوگ خود شیاطین کی رفاقت اختیار کرتے ہیں اس لیے ہم شیاطین کو ان پر مستقل طور پر مسلط کر دیتے ہیں تاکہ وہ انہیں گناہوں اور سرکشی پر مسلسل ابھارتے رہیں۔

آیت ۸۴ ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ’’تو آپؐ ان کے خلاف (فیصلے کے لیے) جلدی نہ کیجیے۔‘‘

عجلت کی نفی پر مبنی یہ مضمون اس سورت میں یہاں دوسری مرتبہ آیا ہے۔ آیت ۶۴ میں رسول اللہ ﷺ کو قرآن مجید کے بارے میں جلدی کرنے سے منع فرمایا گیا تھا کہ وحی کے سلسلے میں آپ ﷺ کا شوق اپنی جگہ مگر اللہ کی حکمت اور مشیت یہی ہے کہ اس کی تنزیل ایک خاص تدریج سے ہو۔ اب آیت زیرِ نظر میں فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ کفارِ مکہ کے بارے میں ایسا خیال اپنے دل میں نہ لائیں کہ انہوں نے ظلم و سرکشی کی انتہا کر دی ہے‘ اس لیے ان کا فیصلہ چکا دینا چاہیے۔ سورۃ الانعام اور اس کے بعد سب مکی سورتوں میں مسلسل قریش مکہ کی سازشوں‘ کٹ حجتیوں اور مخالفانہ سرگرمیوں کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں‘ مگر اس کے باوجود فرمایا جا رہا ہے کہ ابھی آپؐ ان کے بارے میں فیصلے کے لیے جلدی نہ کیجیے۔

﴿اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾﴾ ’’ہم ان کی پوری پوری گنتی کر رہے ہیں۔‘‘

ہمارے ہاں ہر کام ایک فطری تدریج اور باقاعدہ نظام الاوقات کے تحت طے پاتا ہے۔ چنانچہ ان کے بارے میں فیصلہ بھی ہم اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق کریں گے۔ ان کا ایک ایک عمل لکھا جا رہا ہے‘ ان کی ایک ایک حرکت ریکارڈ ہو رہی ہے‘ اسی ریکارڈ کے مطابق ان سے جوابدہی ہوگی اور بالآخر ان کے کرتوتوں کی سزا انہیں مل کر رہے گی۔

آیت ۸۵ ﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾﴾ ’’(ذرا تصور کریں اُس دن کا) جس دن اہلِ تقویٰ کو ہم جمع کر کے لائیں گے رحمٰن کی طرف وفود کی صورت میں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے ہاں اہلِ تقویٰ کا مہمانوں کی طرح استقبال کیا جائے گا‘ جیسے سرکاری سطح پر وفود کا استقبال کیا جاتا ہے۔

آیت ۸۶ ﴿وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾﴾ ’’اور مجرموں کو ہم ہانک کر لے جائیں گے جہنم کی طرف پیاسے۔‘‘

اُس دن مجرموں کو جانوروں کی طرح ہانک کر جہنم کے گھاٹ پر لے جایا جائے گا‘ اس

حالت میں کہ پیاس کی شدت سے ان کی جان پر بنی ہوگی۔

آیت ۸۷ ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾﴾ ''اُس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہیں ہوگا سوائے اس کے جس نے رحمٰن سے کوئی عہد حاصل کر لیا ہو۔''

اُس دن کوئی کسی کی شفاعت نہ کر سکے گا اور کوئی شفاعت کسی کے کام نہیں آئے گی' سوائے اُس شخص کے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا عہد نبھایا ہو۔ جس نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری' اطاعت اور بندگی میں بسر کی ہو (سوائے ان کوتاہیوں اور لغزشوں کے جو بشری کمزوریوں کے تحت سرزد ہوئی ہوں)۔ ایسے لوگوں کے لیے تو شفاعت مفید ہو سکتی ہے' لیکن وہ لوگ جو اپنی زندگیوں میں مستقلاً اللہ کے عہد کی خلاف ورزیاں کرتے رہے' جنہوں نے اپنی زندگیوں کا رخ متعین کرتے ہوئے اللہ کی مرضی اور اس کے احکام کو مسلسل نظر انداز کیے رکھا' ایسے لوگوں کے لیے کسی کی کوئی شفاعت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ شفاعت کے بارے میں یہ مسلّمہ اصول ہم آیت الکرسی کے ذیل میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جس کو اللہ کی طرف سے اِذنِ شفاعت حاصل ہوگا وہ اُس کے حق میں شفاعت کر سکے گا جس کے لیے اِذن ہوگا۔

آیت ۸۸ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے (اپنے لیے) اولاد اختیار کی ہے۔''

آیت ۸۹ ﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾﴾ ''(دیکھو!) تم یہ ایک بہت بھاری بات لائے ہو۔''

یہ عقیدہ گھڑ کے تم لوگ اللہ کے حضور ایک بہت بڑی گستاخی کے مرتکب ہوئے ہو اور تمہاری اس گستاخی کی وجہ سے:

آیت ۹۰ ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾﴾ ''قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں' زمین شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں۔''

آیت ۹۱ ﴿اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾﴾ ''کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے اولاد قرار دی۔''

یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام اور عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا'

جبکہ قریشِ مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔

آیت ۹۲ ﴿وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾﴾ ''اور یہ بات رحمٰن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ (کسی کو اپنی) اولاد بنائے۔''

دراصل اولاد کی خواہش اور ضرورت ایک کمزوری ہے۔ اس بات کی وضاحت پہلے بھی کی جا چکی ہے کہ اولاد کی ضرورت انسان کو ہے اور اس لیے ہے کہ وہ خود فانی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں مرنا ہے' اس دنیا سے ہمارا نام و نشان مٹ جانا ہے۔ اپنی اس کمزوری کے تحت ہم اولاد کی خواہش کرتے ہیں۔ ہم اپنی اولاد کے ذریعے دراصل اپنی ہستی کا تسلسل چاہتے ہیں' اولاد کی شکل میں ہم اس دنیا میں اپنی بقا چاہتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں Pyramids (اہرامِ مصر) کے حوالے سے یہی فلسفہ بیان ہوا ہے:

Calm and self possessed,
Still and resolute,
The Pyramids echo into eternity,
They define cry of man's will,
To survive and conquer the storms of time.

یعنی فراعنہ مصر نے عظیم الشان اہرام اسی خواہش کے تحت تعمیر کیے تھے کہ ان کی وجہ سے ان کا نام اس دنیا میں زندہ رہے گا۔ بہرحال انسان یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ فانی ہے' کسی نہ کسی طریقے سے اس دنیا میں اپنا دوام چاہتا ہے۔ اسی خواہش کے تحت وہ دنیا میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑنا چاہتا ہے اور اسی لیے وہ اولاد کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ بہرحال ایسی کوئی ضرورت ہم انسانوں کو ہی لاحق ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہر کمزوری سے پاک ہے۔ اسے کسی ایسے سہارے کی ضرورت بھلا کیونکر ہوگی!

آیت ۹۳ ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾﴾ ''نہیں ہے کوئی آسمانوں اور زمین میں مگر وہ آئے گا رحمٰن کے حضور بندے کی حیثیت سے۔''

ہر انسان' کسے باشد! اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ایک مطیع فرمان بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ حضور ﷺ بھی ایک بندے کی حیثیت میں اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔ ہم آپ ﷺ کو عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کہتے اور مانتے ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: لِوَاءُ الْحَمْدُ بِیَدِیْ کہ اس روز میدانِ حشر میں حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا۔ حضور ﷺ اللہ کی عدالت میں

کھڑے ہو کر اس کی حمد بیان کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس روز میں اللہ کی جو حمد بیان کروں گا وہ آج بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اس روز ہر کوئی اللہ کے حضور اللہ کا بندہ بن کر حاضر ہوگا۔ اس میں کسی کو کوئی استثناء حاصل نہیں ہوگا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا جائے گا: ﴿یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَاُمِّیَ اِلٰهَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (المائدۃ:۱۱۶) ’’اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بنا لینا‘ اللہ کے سوا؟‘‘

آیت ۹۴ ﴿لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ﴿۹۴﴾﴾ ’’اُس نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے اور پوری پوری گنتی کر رکھی ہے۔‘‘

ان میں سے ایک ایک اس کی نظر میں ہے۔ وہ سب انسانوں کا پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی ایک فرد بھی اس سے بچ کر کہیں اِدھر اُدھر نہیں ہو سکے گا۔

آیت ۹۵ ﴿وَكُلُّهُمۡ اٰتِیۡهِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾﴾ ’’اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اس کے پاس اکیلے اکیلے۔‘‘

اس دن ہر فرد کا محاسبہ ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ نہ ماں باپ ساتھ ہوں گے‘ نہ اولاد‘ نہ بہن بھائی۔ نہ شوہر کے ساتھ بیوی اور نہ بیوی کے ساتھ شوہر۔ نہ کوئی حمایتی‘ نہ مددگار‘ نہ کوئی سفارشی۔ ہر طرف نفسی نفسی کا شور ہوگا‘ ہر شخص کو فکر ہوگی تو صرف اپنی جان کی!

میری کتاب ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ کے ایک باب کا عنوان ہے: ’’قرآن کا قانونِ عذاب‘‘۔ اس باب میں دی گئی تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اجتماعی عذاب جو قوموں پر آتا ہے وہ صرف دنیا میں آتا ہے‘ آخرت کا عذاب فرداً فرداً ہوگا۔ یعنی قوموں کا اجتماعی محاسبہ دنیا میں کیا جاتا ہے جبکہ آخرت میں ہر شخص کا محاسبہ اس کی ذاتی اور انفرادی حیثیت میں ہوگا۔

آیت ۹۶ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾﴾ ’’یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے‘ عنقریب ان کے لیے رحمٰن (لوگوں کے دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔‘‘

یہ فرمان مکہ کے کٹھن حالات میں مؤمنین کے لیے ایک خوش خبری تھی کہ بلاشبہ ابھی اہلِ

ایمان کے لیے بہت مشکل وقت ہے‘ انہیں ہر طرف سے مخالفت اور طعن و تشنیع کا سامنا ہے‘ لیکن بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہی لوگ محبوبانِ خلائق ہوں گے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر لوگ عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کریں گے‘ اور بلال رضی اللہ عنہ کی تعظیم و تکریم دلوں پر راج کرے گی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ’’جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ جبرائیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: مجھے اپنے فلاں بندے سے محبت ہے‘ لہٰذا تم بھی اسے محبوب رکھو۔ چنانچہ جبرائیل اسے محبوب رکھتے ہیں‘ پھر وہ آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو محبوب رکھتا ہے‘ پس تم سب بھی اس کو محبوب رکھو۔ چنانچہ آسمان والے اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں‘‘۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’پھر اس کی مقبولیت زمین میں رکھ دی جاتی ہے۔‘‘(۱) یعنی اہل زمین کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے اور اس طرح اللہ کا محبوب بندہ خلقِ خدا کا بھی محبوب بن جاتا ہے۔

آیت ۹۷ ﴿فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ ’’تو ہم نے آسان کر دیا ہے اس (قرآن) کو آپؐ کی زبان میں‘‘

قرآن کی زبان سہلِ ممتنع کا خوبصورت نمونہ ہے۔ عام قرآنی عبارت سلیس اور آسان عربی زبان میں ہے۔ اس میں ثقیل اور مشکل الفاظ شاذ ہی کہیں نظر آتے ہیں۔

﴿لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَتُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾﴾ ’’تاکہ آپؐ بشارت دیں اس کے ساتھ متقین کو اور خبردار کریں اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو۔‘‘

یعنی آپؐ کی دعوت کا ذریعہ اور وسیلہ‘ آپؐ کی تعلیمات کا مرکز و محور اور آپؐ کا آلۂ انقلاب یہی قرآن ہے۔ آپؐ اسی کے ذریعے سے وعظ و تذکیر کا فریضہ انجام دیں اور اسی کی مدد سے انذار و تبشیر کا حق ادا کریں: ﴿فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ یَّخَافُ وَعِیۡدِ ﴿۴۵﴾﴾ (قٓ) ’’تو آپؐ نصیحت کرتے رہیں قرآن کے ساتھ ہر اس شخص کو جو ڈرتا ہے میری وعید سے‘‘۔ قرآن ایک مؤثر اور جامع وعظ بھی ہے اور تزکیہ نفس کے لیے شافی و کافی دوا بھی۔ اس حقیقت کا اعلان سورۂ یونس میں اس طرح کیا گیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ (باقی صفحہ 69 پر)

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب ذکر الملائکۃ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب اذا احب اللّٰہ عبدا حبّبہ الی عبادہ۔

صدقے کا حقیقی مفہوم اور نیکی اور گناہ کی پہچان

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۱۸/اپریل ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (الحدید)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ:۲۱۹)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ اَنَّ نَاسًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ :

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْاُجُوْرِ، يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ ، وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ ، وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ اَمْوَالِهِمْ، قَالَ : ((اَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُوْنَ بِهٖ؟ اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً ، وَكُلِّ

تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً ، وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً، وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً ، وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنْ مُّنْكَرٍ صَدَقَةٌ، وَفِيْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ))

قَالُوْا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَيَاْتِيْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ؟ قَالَ : ((اَرَاَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ، اَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ اَجْرٌ)) (۱)

سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چند صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا:

''یارسول اللہ ﷺ! اہل ثروت تو اجر وثواب میں سبقت لے گئے' کیونکہ وہ ہماری طرح نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں اور اپنے زائد مال میں سے صدقہ (بھی) کرتے ہیں (مال نہ ہونے کے سبب ہم صدقہ کرنے سے قاصر ہیں)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی صدقے کا سامان مہیا نہیں کیا؟ تمہارا ایک دفعہ 'سبحان اللہ' کہنا صدقہ ہے' تمہارا ایک دفعہ 'اللہ اکبر' کہنا صدقہ ہے' ایک دفعہ 'الحمد للہ' کہنا صدقہ ہے' ایک دفعہ 'لا الہ الا اللہ' کہنا صدقہ ہے' نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صدقہ ہے' اور ہم بستری کرنے میں بھی صدقہ کا ثواب ہے''۔ صحابہؓ نے کہا: یارسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرے تو اسے بھی ثواب ملتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا خیال ہے' اگر وہ اسے حرام جگہ استعمال کرے تو اسے گناہ نہ ہوگا؟ ایسے ہی حلال مقام پر استعمال کرنے پر اجر بھی ملے گا۔''

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((كُلُّ سُلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ ، كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ)) قَالَ: ((تَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ ، وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَابَّتِهٖ فَتَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا، اَوْ تَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ ، صَدَقَةٌ)) قَالَ : ((وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ خُطْوَةٍ تَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ))(۲)

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزکوٰۃ' باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب من اخذ بالرکاب ونحوہ۔ صحیح مسلم' کتاب الزکوٰۃ' باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انسان پر ہر جوڑ کی طرف سے روزانہ صدقہ کرنا ضروری ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے' سواری کے بارے میں کسی سے تعاون کرنا یعنی سواری پر سوار کرنا یا کسی کا سامان لاد کر اس کی مدد کرنا صدقہ ہے' اچھی بات صدقہ ہے' نماز کے لیے اُٹھنے والا ہر قدم صدقہ ہے' راستہ سے ایذا اور تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا بھی صدقہ ہے۔''

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رضی اللہ عنہ ' عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ :

((اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ ، وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (۱)

سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اصل نیکی 'حسن اخلاق' ہے' اور 'گناہ' وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو چاہتا ہو کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو۔''

وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ:

((جِئْتَ تَسْاَلُ عَنِ الْبِرِّ؟)) قُلْتُ : نَعَمْ ، قَالَ : ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ' الْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ ، وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ' وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ))(۲)

اور حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

''تم نیکی کے متعلق پوچھنے آئے ہو (کہ نیکی کیا ہے)؟'' میں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے دل سے پوچھ لو! جس کام پر انسان کا دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے اور جو چیز دل میں کھٹکے اور اس کے متعلق سینہ میں تردد ہو' وہ گناہ ہے۔ خواہ لوگ تمہیں اس کے جواز کا بار بار فتویٰ ہی کیوں نہ دیں!''

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تفسیر البر والاثم۔

(۲) سنن الدارمی' کتاب البیوع' باب دع ما یریبك الی ما لا یریبك ـ و مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث وابصة بن معبد الاسدی نزل الرقة' ح ۱۷۳۲۰۔

معزز سامعین کرام!

اسلام کو دینِ توحید کہا جاتا ہے اور اس کی توحیدی شان کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس میں دین اور دنیا میں کوئی جدائی نہیں ہے۔ اگر آدمی صرف دنیا کو دین کے تابع کر لے تو یہ ایک ہی وحدت بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر وہ کام جسے ہم دنیاداری یا خالص جسمانی اور حیوانی تقاضے سمجھتے ہیں' وہ سبھی دینداری میں شمار ہوں گے۔ یہ بات عبادت کے تصور سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں''۔ اب اگر اس عبادت سے نماز' روزہ مراد ہے تو پھر چوبیس گھنٹے نماز پڑھنی چاہیے اور ہر روز روزہ رکھنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا ممکن نہیں' تو یہاں عبادت سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی پوری زندگی کو اللہ کے تابع کر دو تو پھر رزقِ حلال کے حصول کے لیے تمہارا جدوجہد کرنا' تمہارا کمانا' اپنے اہل وعیال کے لیے تمہارا خرچ کرنا' یہاں تک کہ اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا بھی عبادت شمار ہوگا۔ یہ تصور آپ کو دین اسلام کے علاوہ دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ —— آج جو تین احادیث (۲۵'۲۶'۲۷) ہمارے زیر مطالعہ آئیں گی' وہ اس موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

راویٔ حدیث: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا تعارف

پہلی حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور میں نے کئی مرتبہ ان کا تعارف بیان کیا ہے کہ یہ فقرائے صحابہؓ میں سے تھے۔ ان کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا اور ان کے زہد کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہم پڑھ چکے ہیں کہ:

((مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰی تَوَاضُعِ عِيْسٰی فَلْيَنْظُرْ اِلٰی اَبِیْ ذَرٍّ))

''اگر کسی شخص کو اس سے خوشی ہو کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زہد وتقویٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے تو (وہ میرے اس ساتھی اور دوست) ابوذر کو دیکھ لے۔''

البتہ ایک بات واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک وصف کسی شخص میں اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے تو دوسرے اعتبارات سے بھی اس کے اندر صلاحیت اسی درجے کی

ہو۔ حضرت ابوذرؓ سے ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کہ مجھے بھی آپ کہیں گورنر اور والی لگا دیں‘ تو آپؐ نے فرمایا:

((یَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا)) (۱)

’’اے ابوذر! تم کمزور ہو اور یہ امارت ایک امانت (اور بہت بڑی ذمہ داری) ہے۔ یہ قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہے‘ سوائے اُس کے جس نے اس کے حقوق پورے کیے اور اس بارے میں جو اس کی ذمہ داری تھی‘ اس کو ادا کیا۔‘‘

یعنی درویشی اور زہد ایک الگ چیز ہے‘ جبکہ انتظامی صلاحیت کا ہونا بالکل دوسری بات ہے اور اس اعتبار سے تم کمزور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو مال و دولت جمع کرنے کے حوالے سے ایک مغالطہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ سورۃ التوبہ کی آیات ۳۴‘۳۵ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾

’’اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں اپنے پاس سونا اور چاندی اور خرچ نہیں کرتے اس کو اللہ کی راہ میں‘ تو ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔ جس دن ان (سونے اور چاندی) کو تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں اور پھر داغا جائے گا ان سے ان کی پیشانیوں‘ ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو۔ (اور ساتھ کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے اکٹھا کیا تھا‘ تو اب چکھو مزا اس کا جو کچھ تم جمع کرتے تھے۔‘‘

اسی حوالے سے سورۃ البقرۃ میں دوسرا حکم یہ آیا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

’’(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب کراھۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ۔

کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ جو بھی ضرورت سے زائد ہے!‘‘

قرآن مجید کی ان آیات کی روشنی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک درہم اور ایک دینار بھی اپنے پاس جمع رکھنا حرام ہے۔ یہ عدمِ توازن تھا‘ جبکہ شریعت تو توازن چاہتی ہے۔ آپ کام کریں‘ محنت کریں‘ مشقت کریں‘ کاروبار کریں۔ آپ کو جو ملا ہے وہ اگر ایک خاص حد (فقہی اصطلاح میں جس کو ’’نصاب‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے) سے آگے بڑھ گیا ہے تو زکوٰۃ دیں۔ باقی کو آپ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں‘ لیکن یہ رکھنا لازم نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ چاہیں تو سارے کا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ بھی کر سکتے ہیں‘ لیکن یہ سارا خرچ کرنا بھی لازم نہیں ہے۔ اگر آپ سارا اللہ کی راہ میں دے دیں گے تو بہت اونچا مقام حاصل کر لیں گے‘ لیکن بعض اوقات حضور ﷺ نے اس سے منع بھی فرمایا ہے۔ ایک صحابی حضور ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی کہ میں اپنی ساری دولت اللہ کی راہ میں دے دینا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ اچھی بات نہیں کہ تم اپنی اولاد کو فقیر کر کے چھوڑ جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ پھر آدھا دے دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں‘ آدھا بھی بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ایک تہائی حصہ۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک تہائی ٹھیک ہے اور یہ بھی بہت ہے‘ کم نہیں ہے۔

حدیث کا مطالعہ

زیر مطالعہ حدیث نمبر ۲۵ اصل میں احکام‘ ہدایات اور تعلیمات کا ایک عجیب گلدستہ ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ بہت متوازن ہیں‘ لیکن بسا اوقات آدمی اپنی کسی انتہا پسندی کی وجہ سے خود غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: اَنَّ نَاسًا مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ: ’’اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہؓ میں سے بعض نے حضور ﷺ سے کہا:‘‘ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْاُجُوْرِ ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! دولت مند لوگ تو اجر و ثواب میں آگے نکل گئے‘‘۔ یعنی دولت مند اپنی دولت کو اللہ میں راہ میں خرچ کر کے ہم سے اجر و ثواب میں بازی لے گئے اور ہم ان سے پیچھے رہ گئے۔ آگے خود ہی اس کی وضاحت بھی بیان کر دی

کہ: یُصَلُّوْنَ کَمَا نُصَلِّیْ، وَیَصُوْمُوْنَ کَمَا نَصُوْمُ ''وہ نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں‘ اور وہ روزے بھی رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں‘‘ وَیَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ اَمْوَالِھِمْ ''اور وہ صدقہ کرتے ہیں اپنے زائد اموال میں سے‘‘۔ اس میں یہ سوال مضمر ہے کہ ہمارے پاس مال ہے نہیں‘ تو ہم صدقہ نہیں کر سکتے اور اس اعتبار سے ہم ان سے پیچھے رہ گئے۔

انسانوں میں امیر غریب کی تقسیم کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مابین امیر غریب کی جو تقسیم رکھی ہے یہ اُس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس سے مقصود آزمائش ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے کون ہیں جو ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرتے ہیں! دیکھئے‘ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مابین ایک تقسیم تو فطری طور پر رکھی ہے کہ کوئی شخص پیدائشی طور پر زیادہ ذہین ہے اور کوئی کند ذہن ہے۔ آپ کو آپ کے والدین کی طرف سے کچھ اور قسم کے جینز ملے ہیں‘ جبکہ مجھے کچھ اور قسم کے جینز ملے ہیں۔ یہ تو اللہ کی تقدیر ہے اور ایمان بالقدر کے بارے میں ہم ''اربعین نووی'' کی چوتھی حدیث کے ذیل میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ تو یہ فرق دنیا میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک شخص میں فطری طور پر محنت کا مادہ زیادہ ہے تو وہ زیادہ کما رہا ہے جبکہ ایک میں کم ہے تو وہ کم کما رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر غریبی اور امیری کے فرق کا سبب ہمارے نظام میں کوئی خرابی ہے تو اس خرابی کو درست کرنا چاہیے اور نظام میں مواقع سب کے لیے برابر ہونے چاہئیں۔ بدقسمتی سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ نام نہاد اسلامی ممالک میں ایسا نظام نہیں ہے‘ لیکن دنیا نے یہ کر کے دکھایا ہے۔ امیر کا بچہ ہو یا غریب کا‘ تعلیم دونوں کو ایک ہی ملے گی‘ ورنہ اگر مواقع برابر نہ ملیں تو امیر کا بچہ آگے نکل جائے گا اور غریب کا بچہ پیچھے رہ جائے گا‘ چاہے وہ امیر کے بچے سے ذہین تر ہے اور اگر اسے مواقع ملتے تو شاید وہ امیر کے بچے سے آگے نکل جاتا۔ اسی طرح علاج بھی سب کا ایک جیسا ہونا چاہیے۔ یہ دنیا نے کر کے دکھایا ہے‘ وہ تو کمیونزم میں معاملہ ایک انتہا کو چلا گیا تھا‘ لیکن بعد میں کمیونزم اور سرمایہ داری (Capitalism) کے درمیان ایک synthesis ہوا ہے۔

انسان جب سوچتا ہے تو ایک نظام اپنے ذہن سے اختراع کرتا ہے‘ یہ گویا ایک دعویٰ (thesis) ہوتا ہے۔ لیکن جب اس نظام پر چلتا ہے تو اس کی خرابیاں ظاہر ہوتی ہیں اور ردعمل کے طور پر ایک جواب دعویٰ (anti-thesis) وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ thesis اور anti-thesis آپس میں ٹکراتے ہیں‘ لیکن بالآخران میں صلح ہو جاتی ہے اور یہ مل جاتے ہیں۔ پھر کوشش کی جاتی ہے کہ ان دونوں کی بھلائیاں جمع کر لی جائیں۔ دیکھئے‘ شہنشاہیت اور جاگیرداری کا ختم ہونا نوعِ انسانی کا ترقی کی طرف ایک قدم تھا۔ پہلے یوں تھا کہ یہ بادشاہ ہیں‘ ان کے محل ہیں‘ ان کی عیاشیاں ہیں۔ انہوں نے فوجیں کھڑی کر رکھی ہیں‘ کوئی ذرا بولے تو سہی‘ کوئی ذرا لگان دینے سے انکار تو کرے‘ اُس کا گھر بار جلا کے راکھ کر دیں گے۔ وہ نظام ختم ہوا تو جمہوریت آ گئی‘ جسے دنیا میں سمجھا جاتا ہے کہ بہت اعلیٰ شے آ گئی ہے‘ لیکن اس میں بھی دولت کا نظام جوں کا توں رہا۔ پھر اس جمہوریت سے سرمایہ داری نظام وجود میں آ گیا۔ پہلے جاگیردار لوگوں کی گردنوں پر سوار تھا اب سرمایہ دار سوار ہو گیا۔ سرمایہ دار کا کارخانہ ہے‘ ہزاروں مزدور کام کر رہے ہیں‘ ان کی محنت سے جو حاصل ہو رہا ہے اس کا سب سے بڑا حصہ (lion's share) سرمایہ دار لے جا رہا ہے اور مزدوروں کو بس اس قدر تنخواہ دی جا رہی ہے جس سے ان کے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔ اگر مزدور کہتے ہیں کہ ہم کام نہیں کریں گے تو سرمایہ دار کہتا ہے: نہ کرو‘ بھاڑ میں جاؤ‘ زیادہ احتجاج کیا تو میں کارخانہ بند کر دوں گا۔ اسے پتا ہے کہ اس کا کارخانہ ایک مہینہ بھی بند رہے گا تو اس کے بچوں کو فاقہ نہیں آئے گا‘ جبکہ مزدور جانتا ہے کہ اگر اسے دو دن دیہاڑی نہ ملے گی تو اس کے گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑا جائے گا۔ تو سرمایہ دار مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جب لیبر یونینز کا نظام آیا تو اس کا کچھ علاج کرنے کی کوشش کی گئی‘ بایں طور کہ ان کی ایک bargaining value بن جائے اور وہ قوت کے ساتھ جمع ہو کر اپنے حق کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ بہرحال سرمایہ داری کے ردعمل میں کمیونزم آیا۔ اب یہ کمیونزم بھی چونکہ انسانی ذہن کی پیداوار تھی اس لیے اس کے اندر بھی ایک بے اعتدالی

آ گئی اور وہ تھی ذاتی ملکیت کی مطلق نفی‘ جو ایک احمقانہ بات ہے۔ پہلے تو یہ اس انتہا پر تھے کہ آپ کا گھر اور اس کا سامان‘ حتیٰ کہ آپ کے زیر استعمال سائیکل تک بھی آپ کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ کوئی چیز ذاتی ہے ہی نہیں‘ سب قومی ملکیت ہیں۔ سب کام کریں اور اجرت حاصل کر کے کھائیں پئیں۔ ہاں انہوں نے یہ ضرور کیا تھا کہ اُجرتوں (wages) کے اندر بہت زیادہ فرق و تفاوت نہیں رکھا‘ بس ایک سے تین کی نسبت تھی۔

زیر مطالعہ حدیث میں فقراء صحابہؓ نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ ناانصافی ہے‘ کہ ہمارے پاس دولت نہیں ہے اور ان کے پاس دولت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان حضرات کے پاس جو زائد مال ہے اس کو وہ صدقہ کرتے ہیں۔ یہاں فُضُول کا لفظ آیا ہے اور عربی میں فضول کا مطلب اردو کی طرح بے کار شے نہیں ہے‘ بلکہ یہ فَضْل سے ہے اور فضل کہتے ہیں بلا استحقاق ضرورت سے زائد ملنی والی چیز کو۔ مثلاً آپ نے چند مزدور سو روپے دیہاڑی پر رکھے اور آپ نے دیکھا کہ ایک مزدور دن بھر بڑی تندہی کے ساتھ کام کرتا رہا ہے‘ اسے آپ نے شام کو سو کے بجائے ایک سو دس روپے دے دیے تو یہ فضل ہے۔ وہ دس روپے اس کا استحقاق نہیں ہے اور وہ مانگ بھی نہیں سکتا‘ بلکہ یہ فَضْل ہے۔

صدقہ کی وسعت

اب حضور اکرم ﷺ کا جواب سنیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((أَوَ لَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُوْنَ بِهٖ؟)) ’’کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے صدقے کا سامان مہیا نہیں کیا ہے؟‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھی صدقے کے راستے کھول رکھے ہیں۔ ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً)) ’’تمہارا ہر دفعہ سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے‘‘۔ ((وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً)) ’’اور تمہارا ہر مرتبہ اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے‘‘۔ ((وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً)) ’’اور تمہارا ہر مرتبہ الحمد للہ کہنا صدقہ ہے‘‘۔ ((وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً)) ’’اور تمہارا ہر مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے‘‘۔ یعنی تم جتنی مرتبہ سبحان اللہ‘ الحمد للہ‘ اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کہو گے‘ اتنا

ہی صدقہ شمار ہوگا۔

((وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ)) ’’تمہارا کسی کو نیکی کا مشورہ دینا (یا نیکی کا حکم دینا) بھی صدقہ ہے‘‘۔ آپ کی حیثیت کے مطابق وہ مشورہ بھی ہو سکتا ہے اور حکم بھی۔ جہاں آپ کے پاس اختیار ہے وہاں حکم دینا ہوگا۔ آپ اپنے گھر کے اندر طاقت کے ساتھ نیکی کا نفاذ کر سکتے ہیں‘ چنانچہ آپ کے گھر میں ایک بچہ نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو اسے آپ سزا دے سکتے ہیں۔ یہاں وہ مغربی تصور نہیں ہے کہ بچے کو ہاتھ نہ لگاؤ‘ بچے کو روک ٹوک نہ کرو۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ بچے میں اگر شرم و حیا اور جھجک ہے تو وہ اس کی شخصیت کے صحت مند ارتقاء پانے کا ذریعہ بنے گا۔ لہٰذا اگر آپ کا کہیں اختیار اور طاقت ہے تو نیکی کا حکم دیں اور اگر اختیار نہیں ہے تو مشورۃً اور نصیحتاً نیکی کی بات بتائیں۔ ((وَنَهْيٌ عَنْ مُّنْكَرٍ صَدَقَةٌ)) ’’اور کسی کو برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے‘‘۔ برائی سے روکنے کے تین ذرائع احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ))(۱)

یعنی تم میں سے جو کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ بزورِ بازو اس کو روکے! اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ زبانوں پر بھی پہرے بٹھا دیے گئے ہوں اور حق بات کہنے پر زبانیں کھینچی جا رہی ہوں‘ تو کم سے کم دل میں اس برائی کے خلاف نفرت رکھیں۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اگر آپ بدی کو دیکھتے ہیں اور آپ کو کوئی احساس ہی نہیں ہوتا‘ دل میں اس کے خلاف کوئی نفرت بھی پیدا نہیں ہوتی‘ طبیعت میں کوئی گھٹن بھی محسوس نہیں ہوتی تو پھر آپ کا دل ایمان سے خالی ہے۔ اس لیے کہ دل میں برائی کے خلاف نفرت پیدا ہونا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے‘ اور جب یہ بھی نہیں ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ایمان بھی نہیں ہے۔

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان.....

حقوقِ زوجیت ادا کرنا بھی صدقہ ہے

آگے صدقہ کی وسعت کا معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَفِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَۃٌ)) ''تمہارا اپنی بیوی سے ہم بستری کرنا بھی صدقہ ہے''۔ یہ بات آپ کو دنیا جہان کی مذہبی و اخلاقی تعلیمات میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ تو خالص حیوانی اور نفسانی تقاضا ہے اور اس کو بھی صدقہ قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَیَاْتِیْ اَحَدُنَا شَھْوَتَہٗ وَیَکُوْنُ لَہٗ فِیْھَا اَجْرٌ؟ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم میں سے ایک شخص جو اپنی شہوت کا تقاضا پورا کر رہا ہے' کیا اس پر بھی اسے اجر ملے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَرَاَیْتُمْ لَوْ وَضَعَھَا فِی حَرَامٍ' أَکَانَ عَلَیْہِ وِزْرٌ؟)) ''(تم نے کبھی سوچا ہے کہ) اگر وہ یہی کام حرام راستے سے کرتا تو اس پر گناہ ملتا کہ نہیں؟'' ظاہری بات ہے کہ اگر کوئی حرام ذریعے سے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرتا ہے تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ قابل سزا جرم بھی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَکَذٰلِکَ اِذَا وَضَعَھَا فِی الْحَلَالِ کَانَ لَہٗ اَجْرٌ)) ''اس طرح وہ یہ کام حلال طریقے سے کر رہا ہے تو اس کو اجر بھی ملے گا۔''

یہ وہی بات ہے جو میں نے شروع میں کہی تھی کہ دنیا کو دین کے تابع کر دو تو آپ کی پوری دنیاداری دینداری بن جائے گی۔ آپ کا کسب معاش کی جدوجہد کرنا' بیوی کا حق ادا کرنا' اپنے نفس کا حق ادا کرنا' ملاقات کے لیے آنے والے کا حق ادا کرنا سب عبادت شمار ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((فَإِنَّ لِأَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَإِنَّ لِضَیْفِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَإِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))(۱) ''پس یقیناً تجھ پر تیری بیوی کا بھی حق ہے' تیرے مہمان کا بھی حق ہے اور تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے''۔ اب ان حقوق کو دین کے تابع رہتے ہوئے پورے کرو گے تو یہ عبادت اور باعث ثواب ہے۔

ہر نیکی صدقہ ہے!

اب ہم حدیث ۲۶ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصلاۃ۔

مروی ہے اور اس میں بھی صدقہ کے مفہوم اور وسعت کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت دین ایک حقیقت واحدہ کا نام ہے۔ اس کو اِدھر سے دیکھ لیں یا اُدھر سے' وہ حقیقت میں ایک ہی ہے۔ جیسے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ہے' آپ جس بازار سے بھی جائیں گے گھنٹہ گھر پہنچ جائیں گے۔ اسی طرح دین اسلام بھی ایک حقیقت واحدہ ہے۔ عبادت میں بھی پورا دین موجود ہے' اسی طرح اقامت دین اور شہادت علی الناس میں بھی پورا دین موجود ہے۔ یعنی پورے دین کی تعبیر ایک زاویہ سے ہو سکتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((کُلُّ سُلَامٰی مِنَ النَّاسِ عَلَیْہِ صَدَقَۃٌ کُلَّ یَوْمٍ تَطْلُعُ فِیْہِ الشَّمْسُ)) ''انسانوں کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہے' ہر روز جس میں سورج طلوع ہوتا ہے''۔ آپ کے جسم کے بے شمار جوڑ ہیں' ان میں سے اگر کوئی ایک جوڑ بھی لاک ہو جائے اور اس میں حرکت نہ رہے تو آپ بے بس اور لاچار ہو سکتے ہیں۔ بڑے جوڑوں کا معاملہ بڑا ہے' لیکن چھوٹے جوڑوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اگر آپ کا ہر جوڑ صحیح سالم کام کر رہا ہے تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اور اس شکر کی بہترین صورت صدقہ ہے۔

صدقہ کی تفصیل حدیث ۲۵ میں بیان ہو گئی ہے کہ صدقہ صرف مالی خیرات کا نام نہیں ہے' بلکہ سبحان اللہ بھی صدقہ ہے' الحمد للہ بھی صدقہ ہے' اللہ اکبر بھی صدقہ ہے' لا الٰہ الا اللہ بھی صدقہ ہے' کسی سے نیکی کی بات کہنا اور کسی کو بدی سے باز رہنے کی تلقین کرنا بھی صدقہ ہے' یہاں تک کہ بیوی سے ہم بستری بھی صدقہ ہے۔ جبکہ زیر مطالعہ حدیث میں صدقہ کی وسعت کے حوالے سے ایک اور پہلو سے بات آ رہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((تَعْدِلُ بَیْنَ الْاِثْنَیْنِ صَدَقَۃٌ)) ''دو افراد کے درمیان انصاف کرنا بھی صدقہ ہے''۔ اگر دو افراد کے مابین کوئی جھگڑا یا کوئی اختلاف ہے اور تمہیں ثالث بنایا گیا ہے یا تم ایسی حیثیت پر فائز ہو کہ تم ان کے درمیان صحیح فیصلہ کر سکتے ہو تو تمہارا ان اشخاص کے درمیان عدل و انصاف کا معاملہ کرنا بھی صدقہ ہے۔ ((وَتُعِیْنُ الرَّجُلَ فِیْ دَابَّتِہٖ فَتَحْمِلُہٗ عَلَیْھَا ' اَوْ تَرْفَعُ لَہٗ عَلَیْھَا مَتَاعَہٗ ' صَدَقَۃٌ)) ''اور تمہارا سواری کے

بارے میں کسی سے تعاون کرنا یعنی سواری پر سوار کرانا یا کسی کا سامان سواری پر لاد دینا بھی صدقہ ہے''۔ یعنی کوئی شخص گھوڑے پر چڑھنا چاہ رہا ہے اور وہ ایسا ماہر گھڑ سوار نہیں ہے کہ جو چھلانگ مار کر سوار ہو جاتے ہیں' اور اسے تھوڑا سا سہارا مطلوب ہے تو آپ اس کو سہارا دے کر سواری پر سوار کرا دیتے ہیں یا وہ سواری پر سوار تو ہو گیا ہے' لیکن اس کا سامان نیچے پڑا ہوا ہے اور آپ وہ سامان اسے پکڑا دیتے ہیں' تو یہ بھی صدقہ ہے۔

اچھی بات کہنا اور راستے سے اذیت بخش چیز ہٹا دینا بھی صدقہ ہے

مزید آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ)) ''اور اچھی بات بھی صدقہ ہے''۔ اصطلاحی معنی میں تو ''کلمہ طیبہ'' کلمہ توحید (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه) کو کہتے ہیں' لیکن یہاں عموم ہے اور یہ ہر اچھی اور بھلی بات' نیکی کی بات' ادائیگی حقوق کی تلقین وغیرہ سب کو شامل ہے اور یہ سب عند اللہ صدقہ شمار ہوں گے۔ قرآن مجید میں ''کلمہ طیبہ'' کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾﴾ (ابراھیم) ''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی ہے کلمہ طیبہ کی! (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک پاکیزہ درخت' اس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں۔''

مزید آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَكُلُّ خُطْوَةٍ تَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ)) ''ہر قدم جو تم نماز کے لیے اٹھاتے ہو وہ صدقہ ہے''۔ اسی طرح ((وَتُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ)) ''اور تمہارا راستے سے کسی اذیت بخش چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے''۔ راستے پر چلتے ہوئے آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی اینٹ پڑی ہے اور اس سے کوئی ٹھوکر کھا کر گر جائے گا تو آپ اس کو ایک طرف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی اور موذی شے یا کانٹے والی کوئی چیز راستے میں پڑی ہوئی ہے تو اس کا ہٹانا بھی صدقہ ہے۔

صدقہ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ملاحظہ کیجیے: ((تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ))(۱) ''تمہارا اپنے بھائی کو مسکرا کر ملنا بھی تمہارے لیے

(۱) سنن الترمذی' ابواب البر والصلة والآداب' باب ماجاء فی صنائع المعروف۔ ◀◀◀

صدقہ ہے''۔ تمہارا کوئی عزیز' دوست یا بھائی تم سے ملنے آیا ہے اور تم متبسم چہرے کے ساتھ اگر اس کا استقبال کرتے ہو تو اس کے دل کی کلی کھل اٹھے گی اور اگر آپ نے ''عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا'' کی حیثیت سے آنے والے سے ہاتھ ہی ایسے ملایا ہے کہ بس چھو کے گزر گیا تو اس سے انقباض پیدا ہوگا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو تبسم کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہے۔

زیر مطالعہ دونوں احادیث میں ہم نے دیکھا کہ ایک لفظ ''صدقہ'' میں پورے دین کی تعبیر آ گئی ہے۔ اسی طرح ایک لفظ ''عبادت'' میں پورے دین کی تعبیر ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرۃ) ''اے لوگو! اپنے اُس رب کی عبادت اختیار کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی' تاکہ تم (اللہ کے عذاب سے) بچ جاؤ''۔ اسی طرح ایک لفظ ''اسلام'' اور ایک لفظ ''ایمان'' میں بھی پوری بات آ جائے گی۔ ایمان میں عمل بھی شامل ہے' بایں طور کہ برا عمل انسان کے ایمان کی نفی کرتا ہے اور اچھا عمل ایمان کا ثمرہ اور اس کا پھل ہے۔

نیکی کی پہچان

اب ہم اگلی حدیث (۲۷) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بھی اُن احادیث میں سے ایک ہے جنہیں حضور ﷺ نے جوامع الکلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ حدیث حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْبِرُّ حُسْنُ

◀◀◀ اس روایت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل کاموں کو بھی صدقہ قرار دیا ہے:
((وَإِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِي أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَبَصَرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدِيءِ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَإِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَةَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِي دَلْوِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ))
''تمہارا کسی بھولے بھٹکے کو راستہ بتانا' نابینے کے ساتھ چلنا' راستے سے پتھر' کانٹا یا ہڈی وغیرہ ہٹا دینا اور اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا بھی تمہارے لیے صدقہ ہے۔'' (مرتب)

الْخُلُقِ)) ''اصل نیکی حسن اخلاق ہے'' —— ''نیکی کی حقیقت'' کے عنوان سے ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب'' کا ایک اہم درس سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ پر مشتمل ہے' جسے ''آیت البر'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا رواں ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخر پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔''

اس ایک آیت کے اندر پوری انسانی شخصیت کا ہیولیٰ اور مکمل کردار موجود ہے۔ انسان کے اندر اگر ان مختلف پہلوؤں سے یہ کیفیات موجود ہیں تو پھر وہ واقعی سچا اور نیکوکار ہے اور ایسے ہی لوگوں کو متقی کہا جاتا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کے بھی کچھ اور ہی معیارات ہیں۔ کچھ لوگ ظواہر اور کچھ وضع قطع کے حوالے سے لوگوں کا تقویٰ ناپتے ہیں' لیکن تقویٰ درحقیقت اس متوازن شخصیت کا نام ہے جس کا ذکر آیت البر میں کیا گیا ہے۔

گناہ کی پہچان

نیکی کی تعریف کے بعد آگے گناہ کی پہچان کے حوالے سے آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ)) ''اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے جی میں تشویش پیدا ہو جائے''۔ اس کو یوں سمجھئے' جیسے tip of the iceberg کے نیچے بہت بڑا برف کا تودا پوشیدہ ہوتا ہے' اسی طرح حضور ﷺ کے اس ایک جملہ کے پیچھے بھی پورا ایک فلسفہ مخفی ہے۔ وہ یہ کہ انسان میں نیکی جبلی طور پر موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ صرف حیوان نہیں ہے' بلکہ اس میں روحِ ربانی بھی مستور ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (ص)

''پھر جب میں اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''

روح کو نیکی سے فرحت ہوتی ہے اور بدی سے ایک ضیق (تنگی) اور تشویش کا احساس ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب کے اس سوال پر کہ ''ایمان کیا ہے؟'' ارشاد فرمایا:

((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۱)

''اگر تمہیں نیکی کر کے خوشی ہو اور کوئی برا کام کر کے تمہیں دکھ کا احساس ہو تو تم مؤمن ہو۔''

اگر آپ کے دل میں ایمان موجود ہے تو وہ نیکی کی تائید اور تصدیق کرتا ہے' بلکہ نیکی کے کام کرنے سے ایمان بڑھ جاتا ہے اور برے کام سے ایمان میں کمی آتی ہے اور ایمان کا نور مدھم پڑ جاتا ہے۔

زیر مطالعہ حدیث کے الفاظ ہیں: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) ''اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے دل میں تشویش اور خلجان پیدا ہو جائے اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ وہ لوگوں کو معلوم ہو''۔ اس میں ایک اور اعتماد کی حالت کا بیان ہے۔ انفرادی طور پر انسان کی فطرت کے بارے میں اعتماد کی حالت (mode of confidence) یہ ہے کہ گناہ کرنے پر تشویش ہو' اور ایک اعتماد کی حالت پوری نوع انسانی کے بارے میں ہے کہ انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی حکم لگاتا ہے کہ یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے۔ ایک انفرادی تحت الشعور ہر انسان کا ہے اور ایک پوری نوعِ انسانی کا مجموعی تحت الشعور ہے' جس کو جدید اصطلاح میں collective subconscious mind کہا جاتا ہے۔ نوعِ انسانی کا یہ مجموعی تحت الشعور نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرتا ہے۔ جب آپ یہ نہیں چاہتے کہ یہ بات کسی کے علم میں آئے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ خراب ہے۔ یہ بھی درحقیقت فطرتِ انسانی پر بحیثیت مجموعی ایک اعتماد ہے۔

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی' ح ۶۷۷۔ السلسلة الصحیحة للالبانی: ۹۱/۲

نیکی اور گناہ کے بارے میں اپنے دل سے فتویٰ حاصل کرو!

متذکرہ بالا روایت امام مسلم کی نقل کردہ ہے‘ جبکہ مسند احمد اور سنن دارمی میں یہ روایت حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے ذرا مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپؐ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا: ((جِئْتَ تَسْاَلُ عَنِ الْبِرِّ؟)) ’’تم نیکی کے متعلق پوچھنے آئے ہو (کہ نیکی کیا ہے)؟‘‘ — دیکھئے حضور ﷺ جان گئے کہ وابصہ کیا پوچھنے آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات بعض معاملات پر آپ ﷺ غیبی طور پر مطلع ہو جاتے تھے۔ ویسے تو کچھ اندازہ صاحبِ نظر اہلِ ایمان کو بھی ہو جاتا ہے‘ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))[1] ’’مؤمن کی فراست سے ہوشیار رہا کرو‘ اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے‘‘۔ تمہارے دل میں کیا ہے‘ اسے کچھ نہ کچھ نظر آ جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’اے وابصہ! تم مجھ سے نیکی کے بارے میں پوچھنے کے لیے آئے ہو؟‘‘ قُلْتُ نَعَمْ! ’’میں نے عرض کیا: جی ہاں!‘‘ میں یہی دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ)) ’’تم اپنے دل سے پوچھ لیا کرو!‘‘ انسانی وجود کی تین سطحیں (levels) ہیں‘ سب سے نیچے نفس‘ سب سے اوپر روح اور درمیان میں قلب۔ اگر اس قلب کا میلان نفس کی طرف ہو گیا تو پورے وجود کے اندر نفسانیت‘ ظلمانیت اور تاریکی سرایت کر جائے گی اور اگر اس کا رخ روح کی طرف ہو گیا تو پورے وجود کے اندر نورانیت پھیل جائے گی۔ یوں سمجھئے کہ قلب ایک آئینہ ہے جو اپنے میلان کو منعکس (reflect) کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اوّلاً نور پیدا کیا اور پھر نور سے سب سے پہلے روحِ محمدی کو پیدا کیا۔ نور ہی سے فرشتے اور ارواحِ انسانیہ پیدا کی گئیں۔ تمام انسان جو اب تک دنیا میں آ چکے ہیں یا جو بھی قیامت تک آنے والے ہیں‘ سب کی ارواح بیک وقت پیدا کر دی گئی تھیں اور پھر ان سب سے اللہ تعالیٰ نے عہدِ الست لیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ﴾

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب تفسیر القرآن‘ باب ومن سورة الحجر۔

(الاعراف:۱۷۲) ’’کیا میں ہی نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا تھا: کیوں نہیں (آپ ہی ہمارے رب ہیں)‘‘۔ یہ عہدِ الست ہے جو ہم لے کر دنیا میں آئے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ اے کے بروہی صاحب نے کسی فلسفی کا ایک بہت گہرا جملہ سنایا تھا:

Had you not possesed me in the begining, you would never have searched for me.

لوگ خدا کی تلاش میں غاروں‘ پہاڑوں‘ جنگلوں اور صحراؤں میں جاتے ہیں‘ رہبانیت اختیار کرتے ہیں‘ اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس جملہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ اگر ابتدا میں ہی تمہارا خدا کے ساتھ تعارف نہ ہوا ہوتا تو تم کبھی خدا کو تلاش نہ کرتے۔ وہ تو اصل میں خدا کی واقفیت اور روح کی اطاعت کا تعلق تو اس وقت سے ہے۔ اب وہ روح اللہ کا قرب چاہتی ہے اور اس مادی دنیا کا پردہ روح پر بہت شاق گزرتا ہے۔ بقول مولانا روم ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند!

جس طرح بانسری بانس سے جدا ہونے پر گریہ کناں ہے اسی طرح یہ روح فراق کی شکایت کر رہی ہے۔ اسی لیے موت کو ہمارے ہاں وصال کہا جاتا ہے۔

آگے آپ ﷺ نے نیکی کی پہچان کے حوالے سے وہی بات فرمائی جو ماقبل ہم نے پڑھی: ((اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ)) ’’نیکی وہی ہے جس سے تمہارے جی کو اطمینان حاصل ہو اور اس کی طرف سے تمہارا دل مطمئن ہو جائے۔‘‘ نیکی کی کیفیت میں روح‘ قلب اور نفس ایک وحدت بن جاتے ہیں اور اس وحدت کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں ’’نفس مطمئنہ‘‘ ہے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾﴾ (الفجر) ’’اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل‘ تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پس تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا!‘‘ جب قلب کا رُخ نفس کی طرف ہو جائے اور پورا وجود قلب کے تابع

ہوتے ہوئے نفس کی اطاعت پر آمادہ ہو جائے تو اس کیفیت کو ''نفس امارہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے''۔ ایک کیفیت ڈانواڈول کی سی ہوتی ہے کہ قلب کبھی اِدھر' کبھی اُدھر۔ اس کیفیت کو ''نفس لوّامہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۝۲﴾ (القیامۃ) ''اور میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی''۔ اکثر انسانوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے۔ بُرے سے بُرے انسان میں بھی کبھی کوئی نیکی کا جذبہ ابھر آتا ہے اور اچھے سے اچھے انسان سے بھی بدی سرزد ہو جاتی ہے۔

آگے گناہ کی پہچان کے حوالے سے وہی بات آ رہی ہے جس کا ذکر پہلی روایت میں تھا: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ)) ''اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے جی میں ایک تشویش اور سینے کے اندر ایک تردّد پیدا ہو جائے''۔ یعنی یہ تردّد اور خلجان پیدا ہو جائے کہ یہ میں نے کیا کیا' کیوں کیا! یہ انسان کی باطنی کیفیت ہے اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ تم نے غلط کام کیا۔

دل کے فتویٰ کو ترجیح دو!

آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ)) ''چاہے لوگ تمہیں اس کے جواز کا بار بار فتویٰ کیوں نہ دیں''۔ اگرچہ مفتی حضرات کہہ دیں کہ اس کا جواز ہے' لیکن اگر تمہارا دل کہہ رہا ہے کہ غلط ہے تو غلط ہے۔ اس لیے کہ فتویٰ تو ''کتاب الحیل'' کی رو سے بھی دے دیا جاتا ہے کہ کس طریقے' کس حیلے بہانے سے کوئی راستہ نکالا جائے۔ لیکن تمہارے اندر کا جو مفتی ہے' یہ جو روحِ ربانی تمہارے اندر ہے' اس کا تعلق براہِ راست خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ اس لیے اگر تمہارا دل مطمئن نہیں ہے تو وہ کام مت کرو!

اس کی مثال میں نے عرض کی تھی کہ نورالدین زنگی کا بیٹا شدید بیمار ہو گیا۔ ہر طرح کے علاج معالجے آزمائے گئے مگر بے سود۔ آخر اطباء نے کہا کہ اس کی جان بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ یہ شراب پی لے۔ سلطان نے کہا: معاذ اللہ! میں اپنے بیٹے کو حرام

چیز استعمال کراؤں! اطباء نے بتایا کہ اس پر علماء کا فتویٰ ہے کہ جان بچانے کے لیے حرام چیز استعمال کی جا سکتی ہے۔ سلطان کو تسلی نہ ہوئی اور اس اللہ کے بندے نے فرداً فرداً چاروں مکاتب فکر کے علماء سے فتویٰ لیا تو سب نے یہی کہا کہ جان بچانے کے لیے جان بچانے کی مقدار تک حرام شے استعمال کر لینا جائز ہے۔ لیکن نورالدین زنگی کے دل کو تسلی نہ ہوئی' دل میں خلش اور کھٹک باقی رہی۔ اُس نے مفتیانِ کرام کو اپنے دربار میں بلایا اور کہا: اللہ کی مشیت کے مطابق اگر میرے بیٹے کی موت کا وقت آ ہی گیا ہے تو کیا یہ شراب اسے بچا لے گی؟ انہوں نے کہا: نہیں! اُس نے پوچھا: اگر اللہ اسے صحت دینا چاہے تو کیا وہ شراب کا محتاج ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! اس پر سلطان نے کہا: تو اپنے یہ فتوے اپنے پاس رکھو!

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ لوگوں کے ایمان اور تقویٰ کے اعتبار سے فرق و تفاوت تو رہے گا۔ جتنا آپ کا اندر خالص ہے اتنے ہی خالص فتوے آپ کو وہاں سے ملیں گے ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں ان احادیث کے مندرجات پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات)

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے اشاعتِ عام: 35 روپے

درس ۱۱

اُمراء کا اپنے رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اُسوۂ رسول ﷺ

انجینئر حافظ نوید احمد ☆

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ (الحجر)

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ (الشُّعراء)

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ (الکھف)

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ (الانعام)

☆ مرکزی ناظم تعلیم وتربیت، تنظیم اسلامی naveed.ahmad@quranacademy.com

لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (التوبۃ)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ (آل عمران)

تمہیدی نکات

۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ یازدہم سورۃ الحجر کی آیت ۸۸، سورۃ الشعراء کی آیات ۲۱۵ تا ۲۱۷، سورۃ الکہف کی آیت ۲۸، سورۃ الانعام کی آیات ۵۲ تا ۵۴، سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۲۸ اور سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

۲) منتخب نصاب نمبر۲ کے سابقہ دروس کی روشنی میں ہم سمجھ چکے ہیں کہ دینی فرائض کی ادائیگی ایک مضبوط نظم کی حامل دینی جماعت کے بغیر ممکن نہیں۔ اِس دینی جماعت کے نظم کو صحیح روح اور جذبہ کے ساتھ مستحکم کرنے میں امراء کا اپنے مامورین کے ساتھ رویہ اور طرزِ عمل کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اِن شاء اللہ اِس درس میں ہم امراء کا اپنے مامورین کے ساتھ طرزِ عمل اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ سے رہنمائی لیتے ہوئے سمجھیں گے۔

۳) اِس درس میں امراء کے مامورین کے ساتھ مسنون طرزِ عمل کو تین اوصاف کی صورت میں بیان کیا جائے گا۔ ہر وصف کی وضاحت کے لیے قرآنِ حکیم کے دو دو مقامات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ امراء کے تین مطلوبہ مسنون اوصاف حسبِ ذیل ہیں:

i) مامورین کے ساتھ نرمی، شفقت اور احترام کا برتاؤ

ii) کم حیثیت ساتھیوں کی دلجوئی

iii) ساتھیوں کے لیے رأفت و رحمت اور خوئے دلنوازی

آیات پر غور و فکر

سورۃ الحجر، آیت ۸۸

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ ”آپؐ ہرگز نہ اُٹھائیں اپنی

آنکھیں اُس (مال و اسباب) کی طرف جس سے ہم نے فائدہ پہنچایا ہے اِن کے مختلف طبقات کو‘‘ ..... ﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾ ’’اور نہ افسوس کریں اُن پر‘‘ .....﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’اور جھکا دیں اپنا بازو مؤمنوں کے لیے۔‘‘

- اِس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو پہلی تلقین اِس بات کی گئی ہے کہ آپ ﷺ اہمیت دینے کا معیار کسی کے ایمان اور تقویٰ کو بنائیں نہ کہ اُس کے مال و دولت اور جاہ و حشمت کو۔ جن لوگوں کو ہم نے دنیوی نعمتیں اور مال و اسباب دیے ہیں اُنہیں حق قبول کرنے کی دعوت دیں لی‘ کن اگر وہ تکبر اور ضد کا مظاہرہ کریں تو اُنہیں زیادہ اہمیت نہ دیں۔ وہ حق کے محتاج ہیں جبکہ حق اُن کا محتاج نہیں ہے۔ اُن کے حق قبول نہ کرنے پر زیادہ غمگین ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ کے ذمہ دلسوزی اور پورے جوش و جذبہ سے حق کی دعوت دینا ہے‘ کسی سے حق بات منوانا نہیں۔
- آیتِ مبارکہ میں آپ ﷺ کو دوسری تلقین یہ کی گئی ہے کہ اپنے شانوں کو جھکا کر رکھیے ایمان لانے والوں کے لیے۔ جیسے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لیتی ہے اِسی طرح اے نبی ﷺ آپ بھی اپنے ساتھیوں کو اپنی محبت و عنایت کی آغوش میں لے لیں۔ آیتِ مبارکہ کے اِس حصہ کی مزید وضاحت سورۃ الشعراء کی آیات میں آگے آرہی ہے۔
- یہاں ساتھیوں کے ساتھ رویہ اور طرزِ عمل اختیار کرنے کے حوالے سے وہی الفاظ آئے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۴ میں والدین کے ساتھ طرزِ عمل کے بارے میں آئے ہیں: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ ’’اور جھکا دو اُن دونوں (والدین) کے لیے تواضع و انکسار کے شانے رحمت سے‘‘۔ گویا جو احترام والدین کو دیا جا رہا ہے وہی ساتھیوں کو دیا جائے۔ اُن کے سامنے اپنے کندھے رحمت اور شفقت سے جھکا کر رکھے جائیں‘ تواضع اختیار کی جائے‘ تحکمانہ لہجہ اور انداز اختیار نہ کیا جائے۔
- اِس آیتِ مبارکہ میں ہمارے لیے رہنمائی یہ ہے کہ جو بھی کسی چھوٹی یا بڑی اجتماعیت پر امیر ہو‘ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُس کا طرزِ عمل نرمی‘ شفقت اور احترام کا ہو۔ وہ سمجھے کہ یہ ساتھی اللہ تعالیٰ کا وہ عطیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے میری نصرت و اعانت کے لیے مجھے عطا کیا ہے۔ سورۃ الانفال کی آیت ۶۲ میں ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’وہی ہے جس نے قوت دی آپؐ کو اپنی مدد اور مؤمنوں سے‘‘۔ ہر مامور یہ محسوس کرے کہ

امیر کے دل میں میری بڑی قدر ہے اور وہ میرے ساتھ بڑی محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اہمیت دنیوی مال و اسباب کی نہیں کہ وہ اِس کی بنیاد پر کسی کو عزیز رکھتے ہوں۔ وہ دین کی نصرت کے لیے ایثار و قربانی کو ترجیح دیتے ہیں اور اِسی بنیاد پر کسی سے محبت کرتے ہیں۔

سورۃ الشعراء‘ آیات ۲۱۵ تا ۲۱۷

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’اور جھکا دیں اپنا بازو اُن کے لیے جو پیروی کریں آپؐ کی مؤمنوں میں سے‘‘ .....﴿فَاِنْ عَصَوْكَ﴾ ’’پھر اگر وہ نافرمانی کریں آپؐ کی‘‘ ..... ﴿فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ ’’تو فرما دیجیے بے شک میں بری ہوں اُس سے جو تم کر رہے ہو‘‘ .....﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ﴾ ’’اور بھروسہ کیجیے اُس پر جو زبردست ہے‘ ہمیشہ رحم کرنے والا۔‘‘

- سورۃ الحجر‘ آیت ۸۸ میں نبی اکرم ﷺ کو تلقین کی گئی کہ آپ ﷺ مؤمنوں کے لیے اپنے بازو جھکا دیں۔ اب سورۃ الشعراء‘ آیت ۲۱۵ میں وضاحت کی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ کی توجہ اور عنایت ایسے مؤمنوں کے لیے ہونی چاہیے جو آپ ﷺ کی پیروی کرتے ہیں۔ جو لوگ زبان سے ایمان لانے کے باوجود آپ ﷺ کی پیروی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ درحقیقت سچے مؤمن ہیں ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی روش ترک کرنے کی نصیحت کیجیے۔ اگر وہ باز نہ آئیں تو پھر منافق قرار پائیں گے اور اُن کے ساتھ نرمی نہیں بلکہ سختی کرنی ہوگی۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ‘ آیت ۷۳ اور سورۃ التحریم‘ آیت ۹ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ ’’اے نبیؐ! جہاد کیجیے کافروں اور منافقوں سے اور سختی کیجیے اُن پر‘‘۔ منافقین سے جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی منافقانہ روش سے اب مزید چشم پوشی نہ برتی جائے۔ اُن کی سازشوں کو بے نقاب کر کے کھلم کھلا اُن کی مذمت کی جائے تاکہ معاشرے میں اُن کے لیے عزت و احترام باقی نہ رہے۔ مزید یہ کہ اُن کے ساتھ سخت رویہ رکھا جائے۔
- آیت ۲۱۵ میں کسی بھی اجتماعیت کے امیر کے لیے رہنمائی ہے کہ اُس کا زیادہ التفات اپنے ایسے ساتھیوں کے ساتھ ہو جو سمع و طاعت کے نظم کے پابند ہیں۔ غیر فعّال ساتھیوں کے مقابلہ میں وہ فعال ساتھیوں کو ترجیح دے۔ البتہ غیر فعّال ساتھیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

کرتے ہوئے اُنہیں مسلسل فعال ہونے کی ترغیب دی جاتی رہے۔

- آیت ۲۱۶ میں آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ نافرمانی کرنے والے ساتھیوں سے کہہ دیجیے کہ میں تمہارے نافرمانی کرنے والے طرزِ عمل سے بریٔ الذمہ ہوں اور اگر تم اصلاح کی طرف نہیں آتے تو میں روزِ قیامت تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ ہر امیر کو نافرمانی کرنے والوں کی ایک حد تک اصلاح کی کوشش ضرور کرنی چاہیے' لیکن جب واضح ہو جائے کہ وہ اصلاح قبول کرنے کے لیے بالکل بھی آمادہ نہیں ہیں تو صاف صاف اُن کے طرزِ عمل سے اعلانِ براءت کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے شاید یہ سخت اعلان ہی اُنہیں اصلاح کی طرف سوچنے کے لیے مجبور کر دے۔
- آیت ۲۱۷ میں ہدایت دی گئی کہ اے نبی ﷺ بھروسہ کیجیے اُس ذات پر جو زبردست ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ رحم کرنے والی بھی ہے۔ مامورین اگر نافرمانی کرتے ہیں تو اُن کے اِس طرزِ عمل سے اظہارِ براءت تو کیا جائے لیکن زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت میں معاملہ کل کا کل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ بھروسہ اپنے ساتھیوں کی تعداد پر نہیں' اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھنا چاہیے۔ اگر امیدیں انسانوں سے وابستہ کیں تو مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مامورین کا خلافِ توقع طرزِ عمل امیر کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے گا اور قوتِ عمل کو کمزور کر دے گا۔ اگر بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے تو کسی مامور کے غلط طرزِ عمل سے وقتی طور پر تو صدمہ ہوگا لیکن اِس سے کوئی مستقل منفی اثرات پیدا نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ زبردست بھی ہے اور رحم فرمانے والا بھی۔ اُس کا زبردست ہونا اِس بات کی ضمانت ہے کہ جس کے ساتھ اُس کی مدد ہو اُسے کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ وہ ایسے اسباب سے دین کے کام کی نصرت فرما دے گا جس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ مدد بلاشبہ اُس کی شانِ رحمت کا مظہر ہوگی۔
- آیت ۲۱۷ میں بیان شدہ ہدایت کی افادیت اُس صورت میں زیادہ محسوس ہوتی ہے جب کسی ساتھی میں نافرمانی کا طرزِ عمل بغاوت کے اُس درجے کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ دھونس کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میری بات نہ مانی گئی تو میں جماعت سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ ایسے ساتھی کو امیر آگاہ کر دے کہ میرا بھروسہ تم پر نہیں' اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اگر میں واقعی خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کام کر رہا ہوں تو وہ ضرور میری مدد

فرمائے گا اور اگر میں غلطی پر ہوں تو وہ میری اصلاح فرما دے گا۔

- امراء کے لیے دوسرا مطلوبہ وصف خاص طور پر ایسے ساتھیوں کی دلجوئی ہے جو مال و اسباب کے اعتبار سے کم حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی اجتماعیت میں ایک مسئلہ بڑی نزاکت کا حامل ہوتا ہے جس میں عدم توازن سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ پیچیدگی پیدا ہوتی ہے دو متضاد تحریکی تقاضوں کی وجہ سے۔
- پہلا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی انقلابی دعوت کا اوّلین رُخ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات کی طرف کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اِس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

i) انقلابی دعوت کا مشن نظام کی تبدیلی ہوتا ہے' لہٰذا اِسے اپنا اوّلین مخاطب ایسے لوگوں کو بنانا ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں نظام کی باگ ڈور ہوتی ہے۔

ii) عوام کی اکثریت اونچے طبقات کے تابع ہوتی ہے۔ عوام میں دعوتِ حق کے حوالے سے شرح صدر اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب سوسائٹی کے یہ طبقات بھی دعوت کو قبول کر لیں۔ اگر یہ لوگ مان جائیں تو عوام بھی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔

iii) اللہ تعالیٰ نے اِس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے۔ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات وسائل رکھتے ہیں اور دعوت قبول کر لینے سے اُن کے وسائل حق کی حمایت میں استعمال ہوتے ہیں۔

iv) اعلیٰ طبقات میں سے حق کو قبول کرنے والے کم ہوتے ہیں لیکن جو قبول کرتے ہیں اُن میں سے ایک' ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت طلحہ' حضرت زبیر بن عوام' حضرت سعد بن ابی وقاص' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت سعید بن زید (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا وہ مقام ہے کہ یہ تمام حضرات عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں۔

v) رسول اللہ ﷺ کے فرمان ((خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا)) (متفق علیہ) "اُن میں سے جو جاہلیت میں آگے تھے وہ اِسلام میں بھی آگے ہوں گے جب کہ وہ دین کی تعلیمات کو سمجھ لیں" کے مصداق اِس طبقہ میں ایک خود اعتمادی اور قائدانہ صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈٹ کر اُس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں جسے قبول کر لیں۔ ایک دفعہ جو بات تسلیم کر لیں اس پر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے باہمت اور باعزیمت لوگ آگے آتے ہیں تو تحریک کا کام تیزی سے آگے

بڑھتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے قبولِ اِسلام سے مکہ میں کھل کر اِسلام کی دعوت دینے کا کام آسان ہوگیا۔

vi) انقلاب کے بعد متبادل نظام کو چلانے کی صلاحیت سے یہی لوگ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اِسی طبقہ میں سے تھے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے بعد نظامِ خلافت کو بڑی عمدگی سے مستحکم کیا اور اِس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا۔

vii) اگر یہ طبقات دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئیں تو عوام کے سامنے اُن کی اخلاقی حیثیت گر جاتی ہے اور نظامِ باطل کو تلپٹ کرنے کے لیے یہ بات مفید بن جاتی ہے۔

- مذکورہ بالا وجوہات اِس نوعیت کی ہیں کہ جنہیں نظر انداز کرنا گویا انقلابی مشن کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے منصبِ رسالت پر فائز فرمانے کے بعد پہلا حکم دیا کہ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾﴾ (النّٰزعٰت) ''جاؤ فرعون کے پاس بے شک وہ حد سے بڑھ گیا ہے''۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ جب مکہ کے حالات سے مایوس ہوکر طائف تشریف لے گئے تو وہاں آپ ﷺ نے سب سے پہلے طائف کے تین چوٹی کے سرداروں سے ملاقات کی اور اِسلام کی دعوت اُن کے سامنے رکھی۔ اُن کے انکار کے بعد آپ ﷺ نے عام لوگوں کو دعوت دی۔ مکہ میں آپ ﷺ نے خاص طور پر دعا کی کہ اے اللہ! عمرو بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطابؓ میں سے ایک کو تو ضرور میری جھولی میں ڈال دے۔ دیگر سردارانِ قریش کو دعوت دینے کے حوالہ سے بھی آپ ﷺ بڑی اہمیت دیتے تھے اور اِسی پس منظر سے سورۃ الکہف کی آیت ۲۸ بحث کر رہی ہے۔

- انقلابی دعوت کا ایک دوسرا تقاضا ہے کہ جو لوگ دعوت قبول کرلیں اُن کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے۔ کوئی دعوتِ حق دنیا میں نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ساتھ ایک تدریجی اور مستقل پروگرام تربیت کا نہ ہو۔ تربیت ہی سے دعوت دلوں میں جڑ پکڑتی ہے، نشو ونما پاتی ہے اور پھر برگ و بار لاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن اپنے فوائد و برکات سے معاشرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔ ساتھیوں کی تربیت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُن کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا جائے اور اُن کی اصلاح پر توجہ کو مرتکز کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے

کہ انقلابی دعوت اوّلاً اعلیٰ طبقات کو اپنا ہدف بناتی ہے لیکن اِن میں سے کم ہی دعوت قبول کرتے ہیں اور دعوت کی طرف سب سے پہلے عوام ہی پیش قدمی کرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر غرباء اور فقراء اور مساکین ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے پاؤں کی بیڑیاں اتنی بھاری نہیں ہوتیں جتنی سرمایہ داروں اور سرداروں کے پاؤں میں ہوتی ہیں۔ دعوت قبول کرنے سے سرداروں کی حیثیت اور وجاہت متاثر ہوتی ہے۔ اب جو فقراء و غرباء دعوت قبول کرتے ہیں تو اُن میں ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ امیر کی عنایت مجھ پر ہو اور ہم اُس کی توجہ کا مرکز بنیں۔

- مذکورہ بالا دو تقاضے امیر کی توجہات کے ارتکاز کے اعتبار سے متضاد صورت اختیار کر کے پیچیدگی پیدا کرتے ہیں۔ دعوت کی توسیع اور دوام کے اعتبار سے اعلیٰ طبقات پر توجہ دینا ضروری ہوتا ہے لیکن دعوت کے استحکام کے لیے قریب آنے والے ساتھیوں کی تربیت پر توجہ کا ارتکاز ناگزیر ہوتا ہے۔ اب اِس حوالے عدم توازن سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اعلیٰ طبقات کو نظر انداز کیا تو یہ تحریک کے لیے نقصان دہ ہے لیکن اگر اُن کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی تو فقراء اور مساکین کو صدمہ پہنچے گا۔ اُنہیں گمان ہوگا کہ اصل اہمیت دولت و وجاہت کی ہے اور اُنہیں اپنی فقیری و مسکینی پر حسرت ہوگی۔ سورۃ الکہف اور سورۃ الانعام کی شاملِ درس آیات میں متوجہ کیا گیا کہ اے نبی (ﷺ) بعض حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے آپ کی یہ خواہش اپنی جگہ بجا ہے کہ سردارانِ قریش ایمان لے آئیں، لیکن ایسا نہ ہو کہ اُن کی طرف آپ کی زیادہ توجہ ایسے فقراء کی حق تلفی کا باعث بنے جو پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں اور اپنی تربیت کے لیے آپ کی توجہات کے مستحق ہیں۔

سورۃ الکہف، آیت ۲۸

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ ''اور روکے رکھیے اپنے آپ کو اُن کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام''..... ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ ''طلب گار ہیں اُس کی رضا کے''..... ﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ﴾ ''اور نہ ہٹیں آپؐ کی نگاہیں اُن سے''..... ﴿تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ ''کیا آپؐ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت؟''..... ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ ''اور نہ مانیے بات اُس کی، غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے''..... ﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ﴾ ''اور وہ پیروی کرتا ہے اپنی

خواہش کی‘‘..... ﴿وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ ’’اور اُس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔‘‘

◆ اِس آیتِ مبارکہ کے ابتدائی حصہ میں سردارانِ قریش کے ایک مطالبہ کا ردّ ہے۔ سردارانِ قریش اِس بات پر معترض تھے کہ آپ کے آس پاس بیٹھنے والے تو اکثر وہ لوگ ہیں جو ہمارے غلاموں کے طبقہ سے ہیں‘ اُن کی موجودگی میں ہم آپ کی محفل میں کیسے آسکتے ہیں؟ آپ اُنہیں اپنے پاس سے ہٹائیے۔ اِس آیت میں ارشاد ہوا کہ بعض دینی مصلحتوں کی بنیاد پر آپ کی یہ خواہش بجا ہے کہ سردارانِ قریش کو دعوت کے حوالے سے اہمیت دی جائے لیکن اے نبی ﷺ اِس خواہش کو ایک حد میں رکھنے کے لیے صبر کیجیے۔ صبر کا مطلب یہ ہے سرداران کے مطالبہ کے برعکس آپ اِن فقراء اور ضعفاء کو اپنی صحبت کا زیادہ فیض عطا فرمائیں جو اگرچہ کمزور اور بے حیثیت ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے دعوتِ حق قبول کر چکے ہیں۔ اگرچہ دنیوی مال واسباب اِن کے پاس نہیں ہے‘ لیکن یہ ایمان اور محبتِ الٰہی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں‘ صرف اُسی کی رضا وخوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور صرف اُسی کی عنایات کے طالب ہیں۔ آپ اِن کی تربیت اور تزکیہ کیجیے اور اُن کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچانے کے لیے مسلسل کوشاں رہیے۔ اُن سے اپنی توجہ کو نہ ہٹائیے۔

◆ آگے فرمایا: آپ ﷺ کی نگاہیں اِن فقراء سے نہ ہٹیں‘ کیا آپؐ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت؟ یعنی اگر آپ کی توجہ کا رُخ اِن فقراء کے مقابلہ میں سردارانِ قریش کی طرف زیادہ ہوگیا تو لوگ آپ کے اِس ظاہری طرزِ عمل سے سمجھنے لگیں گے کہ شاید آپ بھی دنیا کی چمک دمک سے متاثر ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو آپؐ کی نیک نیتی کو خوب جانتا ہے‘ لیکن اکثر لوگ تو ظاہر کو دیکھ کر ہی رائے قائم کرتے ہیں۔ آپ کے مخالفین تو اِس مغالطے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ اِن کی اقدار اور ترجیحات بھی وہی ہیں جو ہماری ہیں۔ اِن کی نگاہ میں بھی اُسی مال واسباب کی قدر و قیمت ہے جس پر ہم فدا ہیں۔ گویا فقراء سے توجہ نہ ہٹانے کی ہدایت درحقیقت غلط اندیشوں اور مغالطوں کا سدباب ہے۔

◆ مزید ہدایت دی گئی کہ اُس کی بات نہ مانیے جس کے دل کو ہم نے غافل کر دیا ہے اپنی یاد سے۔ دراصل یہاں سردارانِ قریش کی ایک پیشکش کو رد کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ پیشکش یہ تھی کہ آپ ہمارے ساتھ کشمکش ختم کر کے مصالحت (deal) کر لیں۔ ایک معین

عرصہ تک آپ ہمارے ساتھ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں تو پھر اتنے ہی عرصہ ہم آپ کے ساتھ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں گے۔ کسی داعیٔ حق کے لیے مصالحت کی پیشکش کا یہ جال انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ اِس معاملہ میں براہِ راست مقابلہ یا مخالفت کی فضا نہیں ہوتی اور بظاہر انداز میٹھا ہوتا ہے‘ لیکن اگر کوئی داعی اِس جال میں پھنس جائے تو اُس کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔ مکہ میں جو حالات تھے اُن کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ کے لیے مصالحت کی پیشکش سے متاثر ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ مکہ میں پورے دس سال آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے طنز کے تیر اور تشدد کے وار برداشت کیے تھے۔ پھر آپ ﷺ بڑی امیدوں کے ساتھ طائف گئے کہ شاید کام کا کوئی راستہ کھلے لیکن وہاں تو آپ ﷺ کے لیے آزمائش کا معاملہ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ وہاں کے تین بڑے سرداروں سے انتہائی دل توڑ دینے والا جواب ملا۔ عام لوگوں کا طرزِ عمل اِس قدر جارحانہ تھا کہ اُنہوں نے نہ صرف آپ ﷺ کا مذاق اڑایا‘ فقرے چست کیے بلکہ پتھر برسا کر جسمِ اطہر لہولہان کر دیا۔ جب آپ ﷺ طائف سے واپس مکہ پہنچے تو حالات اتنے مخدوش تھے کہ مکہ میں داخلہ ناممکن تھا۔ کفار آپ ﷺ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ کو مکہ کے ایک سردار مطعم بن عدی کی پناہ لے کر مکہ میں داخل ہونا پڑا۔ یہ ہیں وہ حالات کہ جن کی وجہ سے اِس کا امکان تھا کہ آپ ﷺ سردارانِ قریش کی مصالحت کی پیشکش کو قبول کرنے کی طرف مائل ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اِن کی پیشکش ہرگز نہ قبول کیجیے۔ یہ لوگ حق کو پہچاننے کے بعد اُس سے اعراض کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِن کے دلوں کو غافل کر دیا ہے یعنی اِنہیں محروم کر دیا ہے ایمان لانے سے۔ اِنہیں آپ ﷺ کی رفاقت واعانت کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ یہ سزا اِنہیں اِس لیے دی گئی ہے کہ وہ حق کے بجائے خواہشاتِ نفس کی پیروی کر رہے ہیں اور اِن کے معاملات حدود سے تجاوز کیے ہوئے ہیں۔ وہ بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کی بات ماننے والا بھی بھٹک جائے گا۔

◆ یہاں ہر داعیٔ حق کے لیے رہنمائی ہے کہ وہ کسی بھی مصالحت کے جال میں گرفتار ہونے سے ہوشیار رہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے‘ حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اِس شعر میں بڑی حکیمانہ بات بیان کی گئی ہے۔ باطل کا وجود اپنے بل پر قائم رہ ہی نہیں سکتا لہٰذا وہ مجبور ہوتا ہے کہ خود کو قائم رکھنے کے لیے حق کا کوئی سہارا لے۔ اِس کے برعکس حق بذاتِ خود کھڑا ہوتا ہے اور اُسے باطل سے کسی سمجھوتہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سورۃ الانعام' آیت ۵۲

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) دور نہ کیجیے اُنہیں جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام''.....﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ﴾ ''وہ چاہتے ہیں اُس کی رضا''.....﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ''نہیں ہے آپؐ کے ذمہ اُن کے حساب سے کچھ بھی''.....﴿وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ''اور نہ آپؐ کے حساب سے اُن کے ذمہ ہے کچھ بھی''..... ﴿فَتَطْرُدَهُمْ﴾ ''پھر بھی اگر آپؐ نے دور کیا اُنہیں''..... ﴿فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''تو آپؐ ہو جائیں گے انصاف نہ کرنے والوں میں سے۔''

- اِس آیتِ مبارکہ میں سردارانِ قریش کے اِس مطالبہ کا ردّ زیادہ شدت سے ہے کہ پہلے حضرت محمد ﷺ اپنی مجلس سے فقراء' مساکین اور غلاموں کو الگ کریں' تب ہم اُن کی بات سننے کے لیے آئیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ اُن کی چال ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان لائے ہیں' دور کر دینے کی وجہ سے اُن میں بددلی پیدا ہو اور وہ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں اور آپ تنہا رہ جائیں۔ نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اِن متکبرین کے مطالبہ پر ہرگز اُن مؤمنوں کو اپنی قربت سے محروم نہ کریں جو صبح و شام اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور ہر وقت اُسی کی رضا کے طلب گار ہیں۔
- متکبّر سردارانِ قریش کو اپنی دولت اور سیادت پر ناز تھا اور وہ فقراء' غرباء اور غلاموں کو اپنے خدمت گار اور گھٹیا کام کرنے والے قرار دے کر حقارت آمیز رویہ اختیار کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت کسی کے کردار کی ہے نہ کہ اُس کے پیشے کی۔ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ ایمان لانے والے درویشوں کا کیا پیشہ اور معاشی حیثیت ہے' اِس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں اور آپؐ کے معاشی معاملات سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں۔ اسی طرح آخرت میں بھی ہر ایک نے اپنا حساب خود ہی دینا ہے۔ جب نہ اُنہوں نے آپؐ سے اور نہ آپؐ نے اُن سے کچھ لینا ہے اور نہ دینا ہے تو ایسی صورت میں آپ ﷺ کا اُنہیں اپنی صحبت کی

فیض یابی سے محروم کرنا ناانصافی قرار پائے گا۔

- اِسی پس منظر میں وہ واقعہ پیش آیا کہ جس کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو متوجہ کیا گیا۔ ایک نابینا صحابی عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ ایک بار ایسے وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب آپ ﷺ سردارانِ قریش سے گفتگو فرما رہے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بار بار آپ ﷺ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتے جس پر آپ ﷺ کے چہرے پر کسی قدر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ اِس پر سورۂ عبس کے آغاز میں یوں متوجہ کیا گیا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝١ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۝٣ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝٨ وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝١٢﴾

''اُنہوں نے تیوری چڑھائی اور رُخ پھیر لیا' اِس لیے کہ آیا اُن کے پاس ایک نابینا۔ اور (اے نبی ﷺ!) آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا وہ نصیحت حاصل کرتا تو فائدہ دیتی اُسے نصیحت۔ وہ جو بے پروائی کرتا ہے تو آپؐ اُس کے پیچھے پڑتے ہیں۔ حالانکہ نہیں ہے آپؐ پر کوئی ذمہ داری اگر وہ پاکیزگی اختیار نہیں کرتا۔ اور وہ جو آپؐ کے پاس آیا ہے دوڑتا ہوا' اور وہ ڈر رہا ہے' تو آپؐ اُس سے غفلت برتتے ہیں۔ ہرگز نہیں! بے شک یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے۔ تو جو چاہے نصیحت حاصل کر لے اِس سے۔''

گویا دشمنانِ حق کو تبلیغ تو کی جائے لیکن اُنہیں اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ حق قبول کرنے والوں سے غفلت اور اُن کی حق تلفی ہو جائے۔

سورۃ الانعام' آیت ۵۳

﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ ''اور اسی طرح ہم نے آزمائش کی اُن میں سے بعض کی بعض کے ساتھ''.....﴿لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ﴾ ''تاکہ (مال دار) کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ (فقراء) احسان کیا ہے اللہ نے جن پر ہمارے درمیان میں سے''..... ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ ''کیا نہیں ہے اللہ زیادہ جاننے والا شکر کرنے والوں کو؟''

- سردارانِ قریش کو حیرت تھی کہ اگر ایمان واقعی ایک نعمت ہے تو یہ فقراء اور غرباء کو کیوں مل

گئی؟ یہ اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو پہلے ہم اِسے قبول کرتے۔ یہ غریب غرباء‘ غلام‘ بے حیثیت لوگ‘ کیا یہ ہیں جن پر اللہ کا کرم ہوا ہے؟ اگر یہ ایسے ہی اللہ کے لاڈلے اور پیارے تھے تو کیوں اللہ نے اِنہیں مفلسی میں ڈالا ہوا ہے؟ اُن کے خیال میں جس پر اللہ مہربان ہوتا ہے اُسے اچھی حیثیت دیتا ہے اور جس سے ناراض ہوتا ہے اُسے غربت و افلاس سے دوچار کر دیتا ہے۔ اِس آیتِ مبارکہ میں آگاہ کیا گیا کہ دنیا میں مالی حیثیت اللہ تعالیٰ کی رضا یا ناراض ہونے کی علامت نہیں‘ یہ تو محض امتحان کی صورت ہے‘ کسی کو دے کر آزمایا جاتا ہے اور کسی کو مشکل حالات میں ڈال کر۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے تکبر کرنے والوں کو فقراء کے ذریعے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فقراء اُن کے لیے حق کے پہچاننے میں ایک اوٹ بن گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہمیت دولت و ثروت کی نہیں پاکیزہ سیرت و کردار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کردار رکھنے والے شکر گزاروں کو خوب جانتا ہے اور اُن ہی کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔

- یہ معاملہ ہر رسولؑ کے دور میں پیش آیا کہ اُن رسولؑ پر ایمان لانے میں سبقت فقراء نے کی اور سردارانِ قوم نے اِن فقراء کا مذاق اڑایا۔ اِنہی فقراء کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام سے اُن کی قوم کے سرداروں نے کہا تھا: ﴿هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ﴾ (ھود : ۲۷) ’’کہ اے نوحؑ! تم پر ایمان لانے والے سرسری نگاہ میں ہمارے معاشرے کے گھٹیا لوگ ہیں۔‘‘

سورۃ الانعام‘ آیت ۵۴

﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) جب آئیں آپ کی خدمت میں وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات پر‘‘ ..... ﴿فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ﴾ ’’تو فرمایئے سلامتی ہو تم پر‘‘ ..... ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ﴾ ’’لازم کر لی ہے تمہارے رب نے اپنے آپ پر رحمت‘‘ ..... ﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ﴾ ’’بے شک وہ جس نے کی تم میں سے برائی نادانی سے‘‘ ..... ﴿ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ﴾ ’’پھر اُس نے توبہ کر لی اِس کے بعد اور اصلاح کر لی‘‘ ..... ﴿فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۴﴾ ’’تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا‘ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

- مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن سے زمانۂ جاہلیت میں کئی بڑے گناہ سرزد ہو چکے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کی زندگیاں بالکل بدل گئی تھیں‘ لیکن مخالفینِ اسلام اُن

کو سابقہ گناہوں پر طعنے دیتے تھے۔ اِس پس منظر میں نبی اکرم ﷺ کو فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو تسلی دیں۔ اُنہیں بتائیں کہ اُن کا رب بڑا غفور اور رحیم ہے۔ اُس کی رحمت بڑی وسیع ہے اور تم پر اُس کی طرف سے سلامتی اور عنایات ہیں۔ جو شخص سچی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے تمام سابقہ گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ وہ یقیناً تمہاری اسلام لانے سے پہلے کی برائیوں کو معاف فرما دے گا۔

- انذار اور تبشیر دراصل دعوت کے دو پہلو ہیں اور یہ دونوں ہی بیان ہونے چاہئیں۔ نبی اکرم ﷺ بشیر بھی تھے اور نذیر بھی۔ البتہ بشارت کے مستحق کون ہوں گے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ ایمان لانے والے ساتھی ہی ہوں گے۔ اُن کے لیے بشارت اور رحمت کا مظہر یہ ہے کہ جو بھی اُن سے خطائیں جہالت میں ہوئیں‘ اگر وہ سچی توبہ کر لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی بخشش فرما دے گا۔
- جہالت کا لفظ اردو میں نہ جاننے اور ناواقف ہونے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں اگرچہ اِس کا یہ مفہوم بھی ہے لیکن اِس کا اصل مفہوم ہے جذباتی ہونا۔ گویا اگر جذبات کی رو میں بہہ کر یا عدمِ واقفیت کی بنا پر ایمان لانے والوں سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو گئی اور اُنہوں نے توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی تو اُنہیں بخش دیا جائے گا۔
- اُسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں امراء کی طرف سے اپنے ساتھیوں کی اِسی طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہنی چاہیے۔ اچھے کاموں پر اُن کی تحسین کی جائے اور غلطی پر اُنہیں اصلاح کی طرف متوجہ کر کے بخشش کی امید دلائی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری‘ رحمت اور قدردانی کو بار بار اُن کے سامنے لا کر اُنہیں زیادہ سے زیادہ محنت کی طرف متوجہ کیا جائے۔

سورۃ التوبہ‘ آیت ۱۲۸

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ ’’آ چکے ہیں تمہارے پاس رسول تمہی میں سے‘‘ ..... ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ ’’گراں گزرتا ہے اُن پر تمہارا مشقت میں پڑنا‘‘ ..... ﴿حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ﴾ ’’بے چینی سے خواہش مند ہیں تمہاری بھلائی کے‘‘ ..... ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲۸﴾ ’’مؤمنوں کے ساتھ بہت شفقت اور رحم فرمانے والے ہیں۔‘‘

- سورۃ التوبہ کی اِس آیت میں نبی اکرم ﷺ کی تمام انسانوں اور بالخصوص مؤمنوں کے ساتھ والہانہ محبت و شفقت کے معاملے کو بڑے پیارے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ

ایمان افروز اور خوش کن بشارت دی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نوعِ انسانی ہی میں سے ہیں اور آپ ﷺ کا مبارک وجود نوعِ انسانی کے لیے باعثِ فخر و سرور ہے۔ ارشاد ہوا ''آ گئے ہیں تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے''۔ سب سے بڑھ کر یہ اعزاز بنو ہاشم کے لیے ہے کہ آپ ﷺ اِس خاندان میں سے ہیں۔ دوسرے درجے میں یہ اعزاز قریش کے لیے ہے کیونکہ بنو ہاشم اِسی قبیلہ کا ایک خاندان ہے۔ تیسرے درجے میں یہ اعزاز اہلِ عرب کے لیے ہے۔ پھر چوتھے درجے میں پوری بنی نوع انسانی کے لیے سعادت ہے کہ آپ ﷺ کا تعلق اِس نوع سے ہے۔ اِس سعادت کا ذکر سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں اِن الفاظ میں کیا گیا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''یقیناً احسان فرمایا اللہ نے مؤمنوں پر جب بھیجے اُن میں ایک رسول اُنہی میں سے۔''

- مزید ارشاد ہوا کہ آپ ﷺ پر بہت گراں گزرتی ہے وہ بات جس سے تم لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ تو نوعِ انسانی کے لیے ہر بھلائی کے شدت سے خواہش مند ہیں۔ اُس کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر نعمتیں چاہتے ہیں۔ بظاہر تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تم پر شریعت کی پابندیاں عائد کر کے تمہیں مشکل میں ڈال رہے ہیں، لیکن درحقیقت وقتی مشکلات ہمیشہ ہمیش کی نعمتیں حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جیسے کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے ''جنت کو مشکلات سے گھیر دیا گیا ہے اور جہنم کو خواہشاتِ نفسانی سے'' (بخاری، مسلم)۔ دنیا کی محدود زندگی میں مشقتیں ہیں لیکن یہی مشقتیں اُٹھانے والے آخرت میں جنت کی ابدی راحتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔
- نبی اکرم ﷺ کی رسالت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی خیر خواہی کی کیفیت بھی تمام انسانوں کے لیے ہے۔ آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ ہر فردِ نوعِ بشر سختی سے بچے، اُس کے لیے خیر و فلاح ہو اور وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کرے۔ البتہ آپ ﷺ کی خاص شفقت و عنایت اُن سعادت مندوں کے لیے ہے جو آپ ﷺ پر دل و جان سے ایمان لانے والے اور شریعت کی پابندیاں اختیار کر کے اپنے مؤمن ہونے کا عملی ثبوت دینے والے ہیں۔ اِسی لیے آیتِ مبارکہ کے آخر میں ارشاد ہوا کہ آپ ﷺ ''مؤمنین کے حق میں انتہائی رؤف اور رحیم ہیں''۔ رؤف یعنی مومنوں کے دکھ درد کو محسوس کر کے تڑپ اٹھنے والے ہیں اور رحیم یعنی اُن کے دکھ درد کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ

اللہ تعالیٰ سے بار بار اُن کے لیے رحمت و بخشش کی دعائیں کرنے والے ہیں۔

- اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے ہر امیر کو اپنے مامورین کے لیے اِسی طرح خیر خواہ، شفیق اور دکھ درد میں کام آنے والا ہونا چاہیے۔ اگر امیر اپنے ساتھیوں کے لیے ہر خیر کے حصول کے لیے کوشش کرنے والا اور ہر تکلیف میں اُن کی مدد کرنے والا ہو تو پھر یہ امیر ساتھیوں کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ وہ اُس کے ایسے دست و بازو بنتے ہیں کہ اُس کے کہنے پر اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۹

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) اُس رحمت کی وجہ سے جو اللہ کی طرف سے ہے آپ نرم مزاج واقع ہوئے ہیں اُن کے لیے''..... ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ﴾ ''اور اگر (بالفرض) آپؐ ہوتے سخت مزاج اور سنگدل یقیناً وہ منتشر ہو جاتے آپؐ کے گرد سے''..... ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''تو آپؐ درگزر کیجیے اُن سے''..... ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ''اور بخشش طلب کیجیے اُن کے لیے''..... ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ﴾ ''اور مشورہ کیجیے اُن سے معاملات میں''..... ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ﴾ ''پھر جب آپؐ پختہ فیصلہ کر لیں''..... ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ﴾ ''تو توکل کیجیے اللہ پر''..... ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹﴾ ''بے شک اللہ پسند فرماتا ہے توکل کرنے والوں کو۔''

- اِس آیت میں نبی اکرم ﷺ کے مزاج کی نرمی کی تحسین فرمائی گئی ہے اور اِسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ آپ ﷺ ساتھیوں کے لیے انتہائی شفیق اور رحیم تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ ﷺ مزاج کے تیز اور دل کے سخت ہوتے تو ساتھی آپ ﷺ کے پاس سے بکھر جاتے۔ بقول اقبال ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

- اللہ تعالیٰ ہر میرِ کارواں کو اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی میں اپنا مزاج نرم اور مامورین کے لیے شفقت و محبت والا بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! سختی اور افسرانہ انداز سے ایک ایسی اجتماعیت میں کام کرنے کی خوشگوار فضا پیدا نہیں ہو سکتی جہاں مامورین کسی دنیوی مفاد کے لیے نہیں بلکہ رضا کارانہ طور پر ایک مشن کے لیے مال و جان لگانے کے لیے منظم ہوئے

ہیں۔ یہاں تو نرمی وشفقت ہی ساتھیوں میں نظم کی پابندی' زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی لگن اور قربانیاں دینے کا جذبہ پیدا کرسکتی ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

نگہ بلند' سخن دل نواز' جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

- آیتِ مبارکہ میں آپ ﷺ کی نرم مزاجی کی تحسین کے بعد آپ ﷺ کو چند ہدایات دی گئیں ہیں' جو ہر میرِ کارواں کے لیے مشعلِ راہ ہیں:

i) ساتھیوں کو اُن کی غلطیوں پر معاف کر دیجیے۔ یہ حکم معرکہ اُحد کے پس منظر میں دیا گیا تھا۔ اِس معرکہ میں ساتھیوں سے بہت بڑی غلطی ہوئی اور فتح شکست میں بدل گئی لیکن پھر بھی اُنہیں معاف کرنے کی ہدایت دی گئی۔

ii) ساتھیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کیجیے۔

iii) معاملات میں ساتھیوں سے مشاورت کیجیے۔

iv) فیصلہ کثرتِ رائے سے نہیں بلکہ اپنی بصیرت سے کیجیے۔

v) فیصلہ کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجیے۔ ایسا کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے۔

- ساتھیوں کی غلطیوں سے درگزر کرنا دراصل جماعت میں جوش وجذبہ سے کام کو آگے بڑھانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ ساتھیوں کی غلطیوں کو فراموش نہ کرنا اور بار بار اُن کا ذکر کر کے ساتھیوں کو شرمندہ کرنا جماعت کے اندر ایک کھینچ تان کا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ ساتھی جماعت سے علیحدہ ہو جاتا ہے' یا غیر فعال ہو جاتا ہے' یا اُس میں ضد' ہٹ دھرمی اور اپنی غلطی پر اصرار جیسی برائیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ وہ ڈھیٹ بن کر شرم وحیا کے پردے چاک کر دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ﴾ (النور:۲۲) ''اُنہیں چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تمہیں؟'' ہم سب خطا کار ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرما دے۔ پھر ہمیں بھی ساتھیوں کو معاف کر دینا چاہیے۔ مزید یہ کہ معاف کر دینا انسان کا شعوری فیصلہ ہونا چاہیے اور اپنے دل پر جو میل آیا ہوا اُسے دھو لینا چاہیے۔ ورنہ اِس کھردری سطح پر میل جمع ہوتا رہے گا جو کسی وقت بڑے جماعتی انتشار کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

- ساتھیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا یعنی اُن کے لیے بخشش کی دعا کرنا اُسی وقت

ممکن ہوگا جب اُن کی طرف سے دل صاف ہو چکا ہو۔ جب کسی کے لیے دل میں اخلاص ہوگا تو اب اُس کے لیے دعا بھی دل سے ہوگی۔ دل صاف نہیں ہے تو دعا محض ایک رسم پوری کرنے کے لیے کی جارہی ہوگی۔ چند رٹے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کیے جائیں گے جس سے استغفار کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اِس کے برعکس اگر صاف دل سے دعا کی جائے گی تو اُس سے دعا میں نہ صرف رقت پیدا ہوگی بلکہ ساتھی کے حوالے سے دل مزید صاف ہوگا اور پھر جماعت میں باہمی محبت کی فضا مزید تقویت پائے گی۔

- نبی اکرم ﷺ' معاملہ فہمی' بصیرت اور قوتِ فیصلہ کے اعتبار سے بے مثال مرتبہ کے حامل تھے لیکن اُنہیں بھی معاملات میں مشاورت کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر امیر کو مشاورت کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ پھر معاملات میں ساتھی سے مشورہ کرنا اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ امیر نے غلطی کرنے والے ساتھی کو دل سے معاف کر دیا ہے اور اُسے اپنے اِس ساتھی پر پورا اعتماد ہے۔ جہاں معاملات باہمی مشاورت سے طے کیے جاتے ہیں وہاں ساتھیوں میں ایک احساسِ شراکت پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے دل میں امیر کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ امیر ہم پر اعتماد کرتا ہے اور ہماری رائے حاصل کرنے کو اہمیت دیتا ہے۔ پھر مشاورت کے ذریعہ ہونے والے فیصلہ کو وہ اپنا فیصلہ سمجھ کر کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ گویا مشاورت سے معاملات طے کرنا نہ صرف جماعت میں باہمی اعتماد و یگانگت کی فضا پیدا کرتا ہے بلکہ تحریکی کام کو تیز تر کرنے کے لیے بھی مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

- ''عَزَمْتَ'' یعنی (آپ ﷺ فیصلہ کرلیں) کے لفظ میں فیصلہ کرنے کے بارے میں رہنمائی دی گئی کہ اِس کے حوالے سے اختیار امیر کا ہے۔ وہ ساتھیوں سے مشاورت کے بعد آراء کو تولے گا' گنے گا نہیں۔ وہ تجربہ کار' صاحبِ علم اور صائب الرائے ساتھیوں کی آراء کو زیادہ اہمیت و وزن دے گا۔ گویا یہ مروجہ مغربی جمہوری تصور کی نفی ہے جس میں فیصلہ کرتے ہوئے ہوئے بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا اور اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہو جاتی ہے۔

- آیتِ مبارکہ کے آخر میں تلقین کی گئی کہ جب فیصلہ کرلیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ نہ سوچا جائے کہ کس کی رائے مخالف تھی اور کس کی رائے حق میں تھی' اگر کسی کی

رائے کے خلاف فیصلہ کرلیا تو وہ ناراض ہو جائے گا اور اب اقامتِ دین کے لیے جِدّوجہد میں رکاوٹ آجائے گی۔ یہ جدوجہد اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اگر خلوص اور دیانت داری کے ساتھ درست فیصلہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اِس فیصلہ کے مفید اثرات ظاہر فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں کو پسند فرماتا ہے جو اپنے معاملات کو اُس کے حوالے کرکے اُسی پر توکّل کرتے ہیں۔

دعا ہے کہ منتخب نصاب کے اِن دروس میں جو بھی خیر کی بات تحریر میں آئی ہے اُس پر اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں خلوص کے ساتھ زندگی کے آخری سانس تک اپنے دین کی خدمت کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ' ونفعنی وایاکم بالایات والذکر الحکیم

۞۞۞

بقیہ: بیان القرآن

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے روگ) کی شفاء اور ہدایت' اور اہل ایمان کے حق میں (بہت بڑی) رحمت''۔ اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن سے (وہ چیز) جو شفاء اور رحمت ہے مومنین کے لیے۔''

آیت ۹۸ ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾﴾ ''اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی یا آپؐ سنتے ہیں ان کی کوئی بھنک بھی؟''

کیا آج قومِ ثمود کی کہیں آہٹ سنائی دیتی ہے؟ یا قومِ عاد کا کوئی نام ونشان نظر آتا ہے؟ ماضی کی تمام نافرمان قوموں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کر کے نسیاً منسیاً کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ قریشِ مکّہ جو آج کفر و سرکشی میں حد سے بڑھے جا رہے ہیں وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ' ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم○○

''بیان القرآن'' — ایک شمع نور

امیر محترم جناب حافظ عاکف سعید صاحب

مدیر ماہنامہ ''میثاق'' لاہور

السلام علیکم! خیریت بخیریت تمام' دعا ہے کہ اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے (آمین!)

تنظیم اسلامی کا ایک ملتزم رفیق ہونے کی حیثیت سے ''ندائے خلافت'' اور ''میثاق'' مسلسل زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ رفقاء تنظیم اسلامی اور خاص کر عام قارئین کرام برائے ندائے خلافت اور میثاق کو دعوت رجوع الی القرآن کی طرف راغب کرنے اور مزید ترغیب و تشویق دلانے کی ضرورت ہے تو اس سلسلہ میں راقم ایک رائے یا تجویز پیش کرتا ہے کہ جس طرح ندائے خلافت میں ایک چوکھٹے میں یہ پیغام درج ہے:

تنظیم اسلامی کا پیغام نظام خلافت کا قیام

جناب عالی!

بالکل اسی طرح اگر رفقاء اور عام قارئین کرام کو مطالعہ قرآن حکیم کی طرف راغب کرنے' ترغیب و تشویق دلانے کے لیے ماہنامہ میثاق میں بھی ایک چوکھٹے میں اس طرح کے الفاظ لکھ دیے جائیں یا جو بھی میثاق انتظامیہ مناسب سمجھے تو اُمید ہے کہ دونوں قارئین کرام متاثر ہوں گے اور مطالعہ قرآن حکیم (بیان القرآن) پڑھنے کی کوشش کریں گے (ان شاء اللہ!)

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

والسلام

صوفی محمد صفدر

نقیب تنظیم اسلامی' النور کالونی' راولپنڈی

محترم جناب امیر تنظیم اسلامی .....السلام علیکم!

عرصہ دراز سے دعوت رجوع الی القرآن اور پھر تنظیم اسلامی کی دعوت اس کی اساس اور عمل سے آگاہی ہے۔ میثاق اور پھر حکمت قرآن سے ابتدا سے ہی جو رشتہ استوار ہوا بلا انقطاع جاری ہے۔ کچھ خانگی حالات اور کچھ انتہائی ٹھنڈی طبیعت کے باعث شرکت/بیعت کی سعادت سے محرومی رہی' البتہ قلب و نظر میں لگاؤ' محبت و احترام کی صورت میں شریک ہوں۔ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو قلبی عقیدت و محبت ہوئی اس کے اظہار کے لیے لفظ کفایت نہیں کرتے اور یہ ادب و احترام اور محبت کا جذبہ اس لیے ہے کہ اللہ کریم میری اس ادا سے کہ اس کے محبوب لوگوں اور ان کے نام کا پرچار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہوں میری نجات کا بہانہ بنا دے' ان بزرگوں میں ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ بڑی طمانیت ہوئی کہ ''بیان القرآن'' خوبصورت اور دلکش انداز میں ظاہری و باطنی محاسن کے ساتھ وجہ فروغِ دیدہ اور باعث تسکین قلب و نظر ہوئی اور ہو رہی ہے۔ بہت کم دوسروں سے متاثر ہو پاتا ہوں' لیکن اس مختصر اور جامع تشریح نے گرویدہ بنا لیا ہے۔ سب سے بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ رواں بہتے دریا کی مانند اس میں تسلسل و روانی ہے۔ زندگی کے تاریک راستوں کو منور کرتی شمع نور ہے' کہیں کوئی اُلجھاؤ محسوس نہیں ہوتا۔ انقلاب لانے والی مسلسل صدائے دل نواز ہے۔ قرآن کریم کا یہ معجزہ ہے اور یہ تفسیر اس معجزے کا عملی اظہار کہ یہ کتابِ جلیل منظّم' مربوط' مفصّل' متصل اور اختلافی مسائل کا حل ہے۔ ''بیان القرآن'' کے لامتناہی محاسن پر ارادہ ہے کہ مختصراً سہی اپنے قلبی تاثرات کو لفظی پیکر دوں' حوصلہ افزائی کی آپ سے اُمید ہے۔

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ جو بھی کسی بڑے قافلے یا تحریک سے بچھڑا' نکلا یا نکالا گیا وہ ریگزارِ عالم میں گم ہو گیا۔ لیکن اسے ڈاکٹر صاحب مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص' مشن کی لگن' سعی پیہم' جُہدِ مسلسل اور صراطِ مستقیم کی صحیح نشان دہی اور اس پر گامزن ہونے' درست اور صحیح منزل سے آگاہی اور پھر اس کی طرف جادہ پیمائی کہیے یا محض ربِّ ذوالجلال کی کرم نوازی کہیے کہ کسی نے تو صراطِ مستقیم پر چلنا اور چلانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک منظّم اور بڑی جماعت سے الگ ہوئے بھی تو اپنی شناخت بنائی اور تحریک اسلامی کے تسلسل کو بھی برقرار رکھا۔ روایتی مذہبی حلقوں سے روابط بڑھائے اور ان سے داد بھی پائی۔ چھوٹی موٹی تنقید سے تو اپنے بھی بچ نہیں پاتے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی خوبی بلکہ انفرادیت یہ ہے کہ جن جن ہدایت کے

سرچشموں سے فیض پایا، جن جن سلاسل سے خوشہ چینی کی، فراخ دلی سے اس کا اعتراف کر کے اپنی سوچ کی حقانیت بھی واضح کی۔ اب آپ نے ان کے مشن کو جس طرح سنبھالا اور جس انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہے، عملاً نہ سہی لفظی تائید سے اپنے لیے سعادت سمیٹنا چاہتا ہوں۔

آپ نے ان کے کتابچوں کو یکجا کر کے معنوی ترتیب سے شائع کرنا شروع کیا ہے وہ پسندیدہ اور ضرورت کے عین مطابق ہے جب ''قرآن حکیم اور ہم'' کتاب سامنے آئی اور طمانیت شعور و قلب کا باعث ہوئی تو میں نے جناب کو عریضہ لکھا تھا کہ اب مرکزِ روح و جان، منبعِ ایمان و ایقان، صاحبِ جود و سخا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے ان کی تحریریں یکجا کر دیں۔ جب یہ کتاب (رسول اکرم ﷺ اور ہم) شائع ہوئی تو میں نے تصور کیا کہ آپ نے تو میری فرمائش پوری کی ہے۔ اب اسی حوالے سے تخیل میں ہے کہ آپ اور بھی سوچ رکھتے ہوں گے۔ اب ''ایمان، اسلام اور ہم'' یا ایسے ہی کسی ملتے جلتے نام سے عقائد سے متعلق کتابچے بھی یکجا کر دیں۔ شرک و اقسامِ شرک، توحیدِ عملی، قربِ الٰہی اور اس کے مراتب و ثمرات، ایمان اسلام اور احسان اور حقیقت ایمان جیسی تحریریں یکجا کر دیں۔ اسی طرح عبادات سے متعلقہ تحریروں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے معاشی، معاشرتی، اخلاقی نظامِ حیات سے متعلقہ کتابچے بھی یکجا ہو سکتے ہیں۔ بے شک دعوتی نقطہ نظر سے کتابچے حسب ضرورت الگ الگ شائع ہوتے رہیں لیکن مرکزی لائبریریوں کے لیے، ریسرچ کرنے والوں اور فکر سے مجموعی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یکجا کرنا ضروری ہے۔

دل میں آپ سے اور تنظیم اسلامی کے رفقاء سے ان کی دین حق کی خدمات کے حوالے سے دِلی محبت ہے، اس لیے اظہار کرنا ضروری سمجھ رہا ہے۔ معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کا قیمتی وقت لے لیا جو کہ امت کی امانت ہے۔ مناسب ہو تو جواب سے نواز دیں، سکون و اطمینان کا باعث بنے گا اور آخرت کی نجات کا شاید پروانہ بھی۔

ادارے کے تمام احباب کو سلام مسنون!

فقط والسلام

تابعدار نذر حیات خان (ہیڈ ماسٹر)

محلّہ لویانوالہ، خوشاب، ضلع خوشاب

اَللّٰہُ الصَّمَد

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اَللّٰہُ الصَّمَد کا مطلب ہے کہ اللہ بے نیاز ہے‘ یعنی اس کو کسی طرح کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ میں کامل‘ مکمل اور پورا ہے۔ وہ ستودہ صفات ہے‘ وہ جو چاہے کرتا ہے اور کرسکتا ہے۔ کسی کام کے کرنے میں نہ اسے کسی کے مشورہ کی ضرورت ہے اور نہ تعاون کی۔ موجودات کی ہر چیز‘ جاندار یا بے جان‘ اُسی کی پیدا کردہ ہے اور اُسی کی محتاج ہے۔

اللہ کی مخلوق میں انسان اشرف ہے اور یہ اس کی شاہکار تخلیق ہے۔ جس طرح دوسری تمام مخلوق اس کے سامنے عاجز اور بے بس ہے‘ اسی طرح انسان بھی اپنی خواہشات اور ضروریات کے لیے اللہ کا محتاج ہے۔ کوئی انسان بھی ایسا نہیں جو اس کا محتاج نہ ہو۔ وہی زندگی دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں موت ہے۔ خوشی ہو یا غمی وہی طاری کرتا ہے۔ بیماری اور صحت بھی اس کے قبضہ میں ہے۔

اللہ جو کچھ کرتا ہے وہ صحیح اور اچھا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کو غربت دے تو اس کی مہربانی ہے اور اگر وہ کسی کو امارت دے تو بھی اس کا کام قابلِ تعریف ہے۔ اگر وہ بارش برساتا ہے تو کبھی سمجھا جاتا ہے کہ بہت اچھا ہوا بروقت بارش ہوئی مگر اسی بارش میں کسی کا نقصان ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے ہے کہ بارش نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ انسان کے یہ تاثرات اس کی ناقص سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن میں اتنی صلاحیت نہیں کہ کسی خدائی فیصلے کی حکمت سمجھ سکے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام مبنی برحکمت ہے۔ بارش ہو یا کوئی کام وہ ہمیشہ بروقت ہوتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت کو اللہ کی معرفت حاصل نہیں۔ وہ اسباب اختیار کرتے اور ان پر بھروسہ کر لیتے ہیں اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسباب بھی وہی پیدا کرتا ہے۔ اس کے ہاں کوئی بڑا نہیں مگر جس کو وہ بڑا کرے۔ اللہ نے اپنے کچھ بندوں کو برگزیدہ کر کے دنیا میں لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجا۔ وہ سراپا نیکی اور اچھائی تھے اور ان کو خالق کائنات کی معرفت حاصل تھی۔ لہٰذا انہوں نے کبھی بڑا

بول نہیں بولا بلکہ وہ ہر وقت‘ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے رہے اور اپنی حاجات اس کے سامنے رکھتے رہے اور اس کی مدد کے طالب رہے۔

اللہ تعالیٰ کی صمدیت اٹل حقیقت ہے اور وہی بااختیار ہے۔ کوئی انسان چھوٹا ہو یا بڑا کسی اختیار کا مالک نہیں۔ اللہ کے نبیوں کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی برگزیدگی کے باوجود وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں رہے۔ اس کی مدد طلب کرتے رہے‘ اس کی رضا والے کام کرنے اور اس کی بندگی کے باوجود اس کی مغفرت کے طالب رہے اور معافی مانگتے رہے۔

انسان دھوکے میں آکر دوسرے انسانوں کو بڑا سمجھ بیٹھتا ہے اور اپنی حاجات اور ضروریات میں ان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انسان تو یہاں تک غافل ہو جاتا ہے کہ جانوروں‘ پتھروں اور کئی دوسری حقیر چیزوں کو اپنی قسمت کا مالک سمجھنے لگتا ہے۔ انسان کی اس بے سمجھی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ﴾ (الانعام: ۹۱) ’’لوگوں نے اللہ کی قدر کو نہیں پہچانا۔‘‘

اللہ اکیلا ہی الصمد ہے۔ کوئی جاندار یا بے جان چیز اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ جو چاہے کرے اس پر کوئی نگران نہیں۔ مخلوق میں کوئی فرد ایسا نہیں جو اپنی مرضی اُس پر مسلّط کر سکے بلکہ جس انسان کو جتنی زیادہ معرفتِ خداوندی حاصل ہوگی وہ اتنا ہی بندگیٔ رب میں آگے ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ عبدیت کا جو مقام انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل تھا اور کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول تھے بلکہ رسولوں میں بھی اُن کا درجہ سب سے بلند تھا۔ وہ بھی اللہ کے حضور اپنی بے چارگی‘ کمزوری اور بے بسی کا اظہار کرتے تھے۔ چونکہ آپؐ کا منصب ہی یہ تھا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سکھائیں‘ اس لیے انہوں نے خود اپنے عمل سے لوگوں کو عبدیت کا نمونہ دیا اور تعلیم دی کہ اللہ کے سامنے جتنا کوئی نیچا ہوگا اتنا ہی پسندیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو یہ سبق نہیں دیا کہ اگر تعاون کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے انسان کو اللہ کے ہاں سفارشی بنا کر پیش کریں‘ بلکہ یہ بتلایا کہ وہ خود بے کس اور لاچار بن کر اللہ کے ہاں پیش ہوں اور اپنی حاجت اُس کے سامنے رکھیں اس لیے کہ وہ ہر کسی کی دعا سنتا ہے۔

قرآن مجید میں بہت سی دعائیں اللہ تعالیٰ نے سکھائی ہیں مگر کسی دعا میں کسی نبی یا ولی یا کسی فوت شدہ کو سفارشی کے طور پر پیش کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود دعائیں کرتے رہے اور لوگوں کو دعائیں سکھائیں‘ مگر کسی دعا میں آپؐ نے کسی دوسرے کو دعا

کی قبولیت کے لیے سہارا اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا کوئی فرد اثر انداز نہیں ہوسکتا اور نہ اس کی مرضی کو بدلوا سکتا ہے۔ ہاں اس کے سامنے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کر کے اپنی حاجت پیش کرسکتا ہے اور قبولیت کی اُمید کرسکتا ہے۔ کوئی شخص استحقاق یا دلائل کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ انسان کے دلائل ناقص ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت کو جانتا ہے' وہ جانتا ہے انسان کا نفع کس میں ہے اور نقصان کس میں ہے؟ خود انسان کو اس کا پتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صمدیت یہ ہے کہ انسان اللہ سے اس طور پر مانگے کہ اس کے سامنے اپنے آپ کو ذرہ بے مقدار کردے بلکہ اس کی مرضی پر راضی ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ الصمد ہے۔ کوئی شخص اگر کسی وجہ سے اس سے ناراض ہوجاتا ہے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کا مخلص بندہ بن جاتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کا کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کو نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ وہ ہر کسی کی حمایت اور حمد سے بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے وہ عین صواب ہے اور وہ مخلوق کے کارخانے کو عدل سے چلا رہا ہے۔ جس طرح اس کی ہر صفت کو ہم نہیں سمجھ سکتے اس طرح صفت عدل بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کی حکمرانی عدل پر مبنی ہے جس کو چاہے گا بخشے گا' جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اس کے فیصلے پر کوئی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ وہ خود چاہے تو اپنا فیصلہ بدل دے لیکن مخلوق میں سے کسی کی طاقت نہیں کہ وہ اس کو فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کردے۔ اُس کو کسی طرح کی مجبوری نہیں یہی اس کی صمدیت ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی ہے کہ اُس پر کسی بڑے سے بڑے کی آرزو یا خواہش پوری کرنا لازم نہیں۔ وہ چاہتا ہے تو کسی ادنیٰ اور حقیر سے فرد کی تمنا پوری کردیتا ہے' اس کا ہر فیصلہ اعتراض سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ موت وحیات کا مالک ہے' کسی کو مختصر زندگی دیتا ہے' کسی کو لمبی عمر دیتا ہے اور کسی کو ارذل العمر تک پہنچا دیتا ہے۔ جب کسی کے ہاں فوتگی ہوتی ہے تو لوگ تعزیت کے لیے اس کے ہاں جاتے ہیں اور اکثر کہتے ہیں: ''بڑا افسوس ہے''۔ یہ جملہ درست نہیں۔ وفات دینے والے کا دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی صائب ہوتا ہے اس لیے اس کے کسی کام پر اظہارِ افسوس کرنا درست نہیں۔ ہاں یہ کہا جائے کہ اللہ کا حکم ایسا ہی تھا۔ نیز وفات پانے والے کے حق میں بخشش کی دعا کرنا مناسب ہے۔

اس کی صفت بے نیازی دوسری صفات کی طرح ناقابلِ فہم اور بے انتہا ہے۔ دیکھیے اگر ہمارے باپ' دادا' پردادا اب تک زندہ رہتے تو صورت حال کیا ہوتی۔ وہ خود بیمار کمزور اور اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے سے معذور ہوتے اور نوجوانوں پر بوجھ ہوتے' نوجوان اُن کی خدمت میں لگے رہتے تو افرادِ خانہ کی معاشی جِدّوجُہد کون کرتا۔ یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے اور انسانی فہم کی گرفت میں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی علت سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی وہ اس کا مکلّف ہے۔ اسی طرح کسی کا چھوٹا بچہ ماں باپ کو غمزدہ چھوڑ جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ بچہ ماں باپ کی بخشش کا سبب بن جائے گا' پس اللہ کی بے نیازی کا احاطہ کرنا انسانی استطاعت سے بلند ہے۔ جو شخص راضی برضا ہوگا وہی سکون اور اطمینان کی زندگی گزارے گا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ الوہیت کو مانتے ہیں نہ توحید کو' بلکہ شیطان کی پیروی کرتے ہوئے شرکیہ کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بدعقیدہ اور بدعمل لوگوں کی اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ وہ انہیں بھی روزی دے رہا ہے' اولاد دیتا ہے' دُنیوی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ وہ کسی کی بدعملی اور اسلام دشمنی کی بنا پر نہ اس کی روزی بند کرتا ہے اور نہ اسے دُنیوی نعمتوں سے محروم کرتا ہے۔ اس کا ظرف بے حد کشادہ ہے۔ اس کی صمدیت نے تمام مخلوق کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صمدیت یعنی بے نیازی کا تصور اس سے ہوسکتا ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام انسان دشمن خدا ہوجائیں یا یہ تمام انسان اعلیٰ درجہ کے بندۂ خدا بن جائیں تو کسی صورت میں بھی نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہوسکتا ہے نہ نفع۔ وہ ہر طرح کے نفع ونقصان سے مبرا ہے۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''**بیان القرآن**'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

پاکستان میں نصاب سازی؟

''سچل سرمست'' کی ایک نظم کا تجزیہ

پروفیسر عبداللہ شاہین

حکومت پاکستان کے نوٹیفکیشن NOC No.F-7 8/2003-English کے تحت چھپنے والی انٹرمیڈیٹ کلاس کی انگریزی مضمون کی Book-III میں سندھی صوفی شاعر ''سچل سرمست'' کی نظم بعنوان ''He came to know himself'' شامل نصاب ہے۔

کتاب کے مؤلفین اس نظم کے مطالعہ سے نئی پاکستانی مسلمان نسل کو نہ جانے کیا سکھانا چاہتے ہیں! کیونکہ ایک رائے کے مطابق اس نظم میں ''نظریۂ وحدت الوجود'' بیان کیا گیا ہے' جبکہ دوسری رائے کے مطابق اس میں ''فلسفۂ ہمہ اوست'' کا بیان ہے —— آیئے! جائزہ لیں کہ ''وحدت الوجود'' اور ''ہمہ اوست'' ہے کیا چیز؟

ہمہ اوست

''ہمہ اوست'' فارسی ترکیب ہے' جس کے معانی ہیں ''سب کچھ وہی ہے'' یعنی ہر چیز میں اللہ ہی ہے۔ بالفاظ دیگر خدا ہی نے اس کائنات کی شکل اختیار کر لی ہے' یعنی خود خالق ہی نے مخلوق کی شکل اختیار کر لی ہے' جیسے برف پگھل کر پانی بن گئی اور پانی ابل کر بھاپ بن گیا۔ اب پانی برف بھی ہے اور بھاپ بھی۔ اس کو انگریزی میں ''Pantheism'' کہتے ہیں۔ اس پر اُمت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ یہ نظریہ کفر و شرک ہے۔

وحدت الوجود

''وحدت الوجود'' عربی اصطلاح ہے' جس کا معنی ہے ''وجود'' صرف ایک ہی ہے۔ ''وجودیوں'' کا نعرہ ہے ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ'' (اللہ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں)۔ وہ ''سِوَی

اللّٰہِ وَاللّٰہِ مَا فِی الْوُجُوْدِ'' (اللہ کی قسم' اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں ہے) کے قائل ہیں —— وہ جیتی جاگتی آنکھوں سے زندہ و متحرک کائنات کے انکاری ہیں۔ بقول شاعر ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ''ہے'' نہیں ہے!

اُن کے نزدیک یہ کائنات نظر آتی ہے مگر مانند سراب ہے' اصلاً موجود نہیں ہے۔ بقولِ غالب:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

''وجودیوں'' کے نزدیک یہ کائنات حقیقی ہے ہی نہیں۔ یہ وہمی ہے' خیالی ہے' اعتباری ہے۔ بقول میر ؎

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا!

جبکہ ''ہمہ اوستی'' اس کائنات کو حقیقی مانتے ہیں کہ یہ واقعی موجود ہے' البتہ یہ خالق کا حصہ اور جز ہے یا خود خالق ہی ہے جس کے یہ مختلف روپ ہیں۔

نظم کا متن اور ترجمہ

اب آیئے! ان دونوں نظریات کے تناظر میں شامل نصاب سچل سرمست کی مذکورہ نظم کا مطالعہ کریں' جس کا متن درج ذیل ہے:

"He come to know himself
Naught else had He in view
To be able to realize this
He got enmeshed in Love
He alighted from high heaven
To pour a cascade of Love
Became "Mansur" to Mount the gallows
Just to have his head cut-off
He treaded the bazaars of Egypt
Just to be sold for a slave
"Sachu" speacks the bare Truth
To speak of His sojourn on earth"

(Sachal Sarmast)

''اُس (رب) کو اپنی پہچان حاصل ہوگئی جو اس کا واحد مقصود تھا (کہ وہ پہچانا جائے) اس مقصدِ اصلی کی خاطر وہ (اپنی ہی) محبت میں گرفتار ہوگیا۔ پس اُس نے (وراء الوراء) بلندیوں سے نزول فرمایا تاکہ محبت کی آبشار برسائے — اب وہ (محبت کی خاطر) سولی پر چڑھ جانے کے لیے ''منصور'' بن گیا اور (کہیں بغرضِ محبت) غلام بن کر (بشکل یوسف) مصر کے بازاروں میں بک گیا — ''سچو'' (کوئی بات چھپائے بغیر) صاف' کھری اور کھلی بات کہتا ہے کہ وہ (خدا) خود ہی (مخلوق کی شکل میں) زمین پر اتر آیا اور قیام پذیر ہوگیا۔''

نظم کا تجزیہ

شارحین نظم کا کہنا ہے کہ اس نظم کا مرکزی خیال (theme) وہ حدیث قدسی ہے جس کے الفاظ ہیں:

((كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَرَدْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ فَبِهٖ عَرَّفُوْنِى))

''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا' میں نے ارادہ کیا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا جس کے ذریعہ میں پہچانا گیا۔''

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ' امام سیوطیؒ اور امام ناصر الدین البانیؒ متفق ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔

ملا علی قاری نے بھی اسے موضوع (یعنی من گھڑت) قرار دیا ہے۔ (موضوعات الکبریٰ ۲۷۳/۳۵۳) اور امام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ یہ حدیث نبی اکرم ﷺ کے کلام سے نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی صحیح یا ضعیف سند موجود ہے۔ (کشف الخطاء' ج ۲' ص ۱۷۳)

ثابت ہوا کہ یہ دروغ گوئی پہ مبنی روایت ہے جسے پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ تاہم بفرضِ محال اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کا مفہوم وہ نہیں جو شاعر موصوف نے اپنی مذکورہ بالا نظم میں بیان کیا ہے کہ خدائے واحد اپنا ہی گرویدہ ہو کر کہیں یوسف علیہ السلام کی صورت غلام بن کر مصر کے بازاروں میں بک گیا اور کہیں منصور بن کر خود پر نچھاور ہونے کے لیے سولی پر چڑھ گیا۔ یہ بات سراسر قرآن مجید اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن مجید بتاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کسی بہروپ کی وجہ سے غلام بن کر بازارِ مصر میں خود فروش نہیں ہوئے بلکہ ان کے بھائیوں نے سازش تیار کی کہ یوسفؑ ابا جان کا بڑا چہیتا ہے' اس کو قتل کر دو یا دیس نکالا دو تاکہ تم باپ کے منظور نظر بن سکو۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ﴾ (آیت ۹)

''(چنانچہ) قتل کر دو یوسف کو یا اسے پھینک آؤ (دور) کسی علاقے میں تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے۔''

﴿قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِىْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ﴾ (آیت ۱۰)

''کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے کہ یوسف کو قتل مت کرو اور ڈال آؤ اسے کسی باؤلی کے طاقچے میں' اٹھا لے جائے گا اس کو کوئی قافلہ''

﴿وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''اور (کچھ عرصہ بعد) ایک قافلہ آیا تو انہوں نے بھیجا اپنے آگے چلنے والے کو تو اس نے لٹکایا اپنا ڈول۔ وہ پکار اٹھا کہ خوشخبری ہو! یہ تو ایک لڑکا ہے۔ اور انہوں نے اسے چھپا لیا' ایک پونجی سمجھ کر۔''

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ﴾ (آیت ۲۰)

''اور (مصر پہنچ کر) انہوں نے بیچ دیا اس کو بڑی تھوڑی سی قیمت پر چند درہم کے عوض۔''

قارئین! اب آپ خود فیصلہ کریں کہ شاعر کے بقول ''اللہ تعالیٰ اپنے ہی عشق میں گرفتار ہو کر بصورت یوسف غلام بن کر مصر کے بازاروں میں کوچہ گردی کرتا رہا یا سازش و جبر کے تحت عزیز (حکمران) مصر کے ہاتھوں سستے داموں یوسف علیہ السلام کو بیچ ڈالا گیا۔''

بعد ازاں جو کچھ ہوا وہ یوں ہے کہ اسی حکمران کی بیوی نے یوسفؑ کو برائی کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْٓ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ﴾ (آیت ۲۳) ''اللہ کی پناہ!'' وہ (تمہارا خاوند) تو میرا مربی ہے' جس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے''...... لہٰذا میں ایسا ظلم نہیں کر سکتا۔

﴿...... ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾﴾

''...... پھر اُن لوگوں کو یہ بات سوجھی ساری نشانیاں دیکھ لینے کے بعد کہ اس کو کچھ عرصہ کے لیے جیل میں ڈال دیا جائے۔''

یعنی باوجودیکہ ان لوگوں نے عزیز مصر کی بیوی کی بدنیتی کے آثار دیکھ لیے تھے' یہی رائے ٹھہری کہ کچھ عرصہ کے لیے یوسفؑ کو قید میں ڈال دیا جائے' تاکہ اس عورت کے فتنہ سے بچا جا سکے۔

اب آپ خود ہی سوچیے! کہ وہ کیسا عشق ہے جو اللہ تعالیٰ کو عرش سے فرش پر لے آیا—— اور وہ کیسا خدا ہے جو مخلوق کے ہاتھوں چاہ بردی، بردہ فروشی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے؟—— یقیناً آپ عقل سلیم کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ محض شاعرانہ مبالغہ ہے اور قرآن مجید سے متصادم ہونے کے باعث ایک لغو بات ہے۔

اسی طرح شاعر کا یہ کہنا بھی امر واقعہ کے خلاف ہے کہ:

''وہ (خدا) منصور بن گیا، پھانسی کے پھندے کو گلے سے لگانے کے لیے اور محض محبت
کی آبشار برسانے کے لیے سر کٹوانے کو تیار ہو گیا۔''

جبکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ منصور ابن حلاج صوفی نے انتہائی غلو سے کام لیتے ہوئے ''اَنَا الْحَقّ''☆ (میں خدا ہوں) کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی بنا پر اُس وقت کے جید علمائے امت مسلمہ کے متفقہ فتویٰ کے مطابق ''اس کلمہ'' کو کفر قرار دیا گیا اور منصور قابل گردن زدنی ٹھہرا۔

غور فرمائیے کہ وہ خدا کیسا ہے؟ جو بقول شاعر مخلوق کے ہاتھوں پھانسی کے پھندے پر جھول گیا اور وہ عشق کیسا ہے، جو اذیت پسند بنا دے؟—— عشق و محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ (خدا) کوئی لذت کوشی والا کام کرتا تا کہ تلذذ اٹھاتا اور لطف اندوز ہوتا، نہ کہ آزار پسند بن جاتا اور خود کو تختۂ دار پر لٹکا کر مسرور ہوتا! بلاشبہ یہ اختراع و افترا ہے جسے شاعروں نے طرح طرح کی قافیہ پیمائی سے زینت بخشی اور خوش عقیدگی میں بدل دیا۔ جیسے ؎

خود رازِ انا الحق کو ''وہی'' کھول رہا ہے
''منصور'' کے پردے میں خدا بول رہا ہے!

کبھی یوں لب افشا ہوئے:

تھا ''انا الحق'' حق مگر منصور کو کہنی نہ تھی
یار کی محفل سے باہر، یار کی محفل کی بات!

☆ بلاشبہ ''انا الحق'' دعوائے خدائی تھا کیونکہ مفتیانِ اسلام کے متفقہ فتویٰ کے علاوہ مغربی مفکر آر۔اے نکلسن بھی اپنی تحقیقات یوں سپرد قلم کرتا ہے:

''.....انا الحق کے کلمات ابن حلاج کی کتاب بعنوان ''کتاب الطواسین'' میں موجود ہیں..... یہاں ہم اس سوال سے بحث کی ابتدا کر سکتے ہیں کہ 'انا الحق' سے ابن حلاج کی کیا مراد تھی؟—— ''الحق'' کا لفظ عموماً صوفیا ''خالق'' کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور انہی معنوں میں ''کتاب الطّواسین'' کے مؤلف نے انا الحق کا کلمہ ''میں خالق (یعنی خدا) ہوں'' استعمال کیا ہے۔

لیکن حقیقی معرفتِ ربانی وہی ہے جسے سورۃ الاعراف کی درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾﴾

''اور یاد کرو جب نکالا آپؑ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ مبادا تم یہ کہو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔''

امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اس نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے اقرار کروایا کہ اللہ ہی ان کا رب اور مالک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں..... یعنی اللہ نے انہیں وجود بخشا تو وہ اس (معرفت ربانی) کی گواہی دے رہے تھے اور زبانِ حال و قال سے کہہ رہے تھے: کیوں نہیں! (تو ہمارا پروردگار ہے) معلوم ہوا کہ اس سے مراد اقرار توحید ہے۔ (یعنی مخلوق نے جان لیا، پہچان لیا اور مان لیا کہ اللہ ہمارا رب ہے)۔''

روز ازل اس معرفت کے بعد کہ اللہ ہی بندوں کا خالق، مالک اور رازق ہے، منطقی طور پر یہ حکم جاری ہو گیا کہ:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریت)

''ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔''

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہاں لفظ 'لِيَعْبُدُوْنِ'' سے مراد 'لِيَعْرِفُوْنِ'' ہے کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کو اپنا رب پہچان کر اُس کی عبادت میں جت جائیں —— غرضیکہ شاعر نے جو کچھ بیان کیا ہے، دراصل یہ وہی خیالات ہیں جن کو یونانیوں کے ہاں ''حلول'' کہا گیا ہے۔ یعنی خدا انسان میں رچ بس جاتا ہے، جیسے چینی پانی میں حل ہو کر پانی کا جز بن جاتی ہے اور اسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بقول شاعر ؎

''من تو شدم، تو من شدی''
''میں، تو بن جاؤں اور تو، میں بن جا۔''

تا کہ

''من دیگرم ' تو دیگری''

''میں اور ہوں' تو اور ہے''

والی بات ہی نہ رہے' بلکہ ہر قسم کا فرق و تفاوت اٹھ جائے۔ یعنی ؎

تو تو نہ رہے ' میں میں نہ رہوں
اک دوجے میں کھو جائیں

اسی طرح ہندوؤں کے ہاں نظریۂ ''اوتار'' ہے جس کے تحت ''رام'' وغیرہ کو بھگوان کا اوتار مانا جاتا ہے (یعنی بھگوان' رام کی صورت میں روئے زمین پر اتر آیا ہے) نیز آتما (انسانی روح) اور پرماتما (خدا کی ہستی) کے ملاپ اور سنجوگ کا فلسفہ بیان کیا جاتا ہے' کہ آتما پرماتما باہم دگر ایک ہو جاتے ہیں۔ پردے میں ہوتا ہے تو ''پرماتما'' اور پردے سے باہر آتا ہے تو ''آتما'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسی فلسفہ کی بنیاد پر بڑی جذباتی شاعری کی گئی ہے: ؎

ذرا سامنے تو آؤ ' چھلیئے (فریبی)
چھپ چھپ چھلنے میں کیا راز ہے؟
یوں چھپ نہ سکے گا پرماتما
میری آتما کی یہ آواز ہے!

یعنی بھگوان نے ایسی آنکھ مچولی کی ہے کہ خود ہی انسانی روح کا روپ دھار کر روئے زمین پر نمودار ہو گیا ہے۔ لیکن زیادہ دیر تک یہ روپ بہروپ چھپ نہیں سکے گا بلکہ غور و خوض سے یہ راز کھل جائے گا۔

علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں میں بھی مختلف ناموں اور زاویہ نگاہ سے یہ فلسفہ بگھارا جانے لگا۔ چنانچہ ''وحدت الوجود'' کے بانی ابن عربی' فصوص الحکم میں کہتے ہیں:

سُبْحَانَ مَنْ اَظْهَرَ نَاسُوْتَهٗ سِرًّا ثُمَّ بَدَا فِیْ خَلْقِهٖ ظَاهِرًا صُوْرَةَ الْاٰكِلِ وَالشَّارِبِ

''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے چھپے ہوئے ناسوت کو ظاہر کر دیا' پھر وہ اپنی مخلوق میں کھانے اور پینے والوں کی صورت میں صاف ظاہر ہو گیا۔''

کسی نے ''خودی'' اور ''خدا'' کا تصور پیش کیا کہ انائے صغیر (small ego) انائے کبیر (The Big Ego) میں مدغم ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی نظریات کے تحت مسلمان شعراء نے بھی ایسی شاعری کی' جیسے بقول احمد ندیم قاسمی ؎

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں' سمندر میں اتر جاؤں گا

یعنی انسان موت پا کر فنا نہیں ہوتا بلکہ وصال پا کر واصل باللہ ہو جاتا ہے۔

حالانکہ کتاب اللہ کے مطابق ''روح انسانی'' اللہ کے امر سے وجود میں آتی ہے جسے انسان کی پیدائش کے وقت جسد عنصری میں ڈالا جاتا ہے اور جسم انسانی کے مردہ ہو جانے کے بعد اسے قفس عنصری سے آزاد کر کے آسمان کے اُس پار مقام ''علیین'' میں پہنچا دیا جاتا ہے یا تحت الثریٰ میں ''مقام سجین'' میں قید کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال ایسے افکار و اشعار صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں اور حقیقی معرفتِ ربانی کے لیے درج ذیل سوالات ایک مؤحد شاعر نے یوں اٹھائے ہیں:

کس نے ''کُن'' کہہ کر کیے پیدا زمیں و آسمان؟
ذرّے ذرّے سے ہے کس کی عظمت و قدرت عیاں؟
حمد میں کس کی طیور خوش نوا ہیں نغمہ خواں؟
کون ہے بے شرکت غیر' اس جہاں کا حکمراں؟
ابرِ رحمت کون لاتا ہے ہوا کے دوش پر؟
کس کے فیضانِ کرم سے ڈالیاں ہیں پُرثمر؟
پردۂ ظلمت سے پیدا کون کرتا ہے سحر؟
کس کے ہیں یہ کوہ و صحرا' کس کے ہیں یہ بحر و بر؟
کس نے گلشن میں کیا سرو و سمن کا اہتمام؟
حکم سے کس کے ہوا جاری ہواؤں کا خرام؟
کس نے ہست و بود کا پیدا کیا ایسا نظام؟
انبیاءؑ نے کس کی ''وحدت'' کا دیا ہم کو پیام؟

جن کا واحد منطقی' قطعی اور حتمی جواب بھی شاعر نے خود ہی سورۃ الاخلاص کی روشنی میں دیا ہے: ؎

''هُوَ اللّٰهُ اَحَد ' هُوَ اللّٰهُ اَحَد ' هُوَ اللّٰهُ احد!''

''وہی ایک اللہ جو بے نیاز ہے' نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی برابری کرنے والا ہے۔''

❁❁❁

پاکستانی معاشرے میں ناگوار سمجھے جانے والے دو جائز کام

① مرد کی دوسری شادی

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

یوں تو حلال اور جائز چیزوں میں عنداللہ سب سے بڑی اور ناگوار چیز 'طلاق' ہے جس کو واقعتاً ناگوار ہونا ہی چاہیے' لیکن ہمارے معاشرے میں طلاق چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر ھَنِیْئًا مَرِیْئًا دی جارہی ہے۔ مثلاً بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں بیوی کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے طلاق دے دی جاتی ہے' چند غلطیوں کے باعث ساس صاحبہ بڑے آرام سے بیٹے سے اس کی بیوی کو طلاق دلوا دیتی ہے۔ خود شوہر حضرات بھی اس کام میں بہت ماہر ہیں اور وہ یہ ناگوار اور انتہائی ناپسندیدہ کام کرتے ہوئے ذرا نہیں سوچتے کہ قرآن میں تو یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں اپنی بیویوں کی کوئی ایک بات یا عادت بری لگتی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اللہ نے اس کے باوجود اس میں تمہارے لیے خیر رکھا ہو۔ ویسے نامساعد حالات میں بھی اگر طلاق دینی مقصود ہو تو اس کے لیے بھی اسلام نے ایک طریقہ بتلایا ہے' یعنی تینوں طلاقیں ایک ہی وقت میں نہیں دینی چاہئیں' بلکہ ہر طلاق میں ایک ماہ کا وقفہ ہونا چاہیے تاکہ زوجین کو افہام وتفہیم کا موقع مل جائے۔ لیکن آج کل تو ہمارے معاشرے میں اکثر مرد شاید اپنی قوامیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ایک ہی وقت' بلکہ ایک ہی سانس میں دس دس طلاقیں دے دیں اور بیوی کو' دن ہو یا رات کا اندھیرا' گھر سے نکال کر باہر کھڑا کر دیں۔ پھر بچے یا تو بیوی سے چھین لیے جاتے ہیں یا پھر بچوں کو بھی بیوی کے ساتھ ہی دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے دھکا دے دیا جاتا ہے اور لڑکی کے گھر والوں کو فون کر دیا جاتا ہے کہ آ کر اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔

بہرحال یہ میرا موضوع نہیں ہے' بلکہ میرا موضوع یہ ہے کہ دو جائز اور حلال چیزوں کو ہمارے معاشرے میں کراہت والی اور ناجائز چیزوں سے بھی بڑھ کر برا اور ناگوار سمجھا جاتا ہے۔ اُن دو کاموں میں سے ایک ہے: مرد کی دوسری شادی' اور دوسرا ہے: بہو کا الگ گھر کا

مطالبہ کرنا۔ یہ دو کام ہمارے معاشرے میں کسی صورت ہضم ہونے والے نہیں ہیں' اس لیے کہ ہمارا معاشرہ ہندوانہ رسومات' مغربی تہذیب اور اسلامی اقدار کا ملغوبہ ہے اور یہاں ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کی مانند جس کا جہاں زور چلا اس نے وہی کلچر اور ماحول اپنا لیا۔

اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت

عرب معاشرے میں کثرتِ ازدواج بہت عام تھا اور اس میں حدود وقیود سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس معاملے میں حرام رشتوں کی تمیز بھی ختم ہو چکی تھی۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے کثرتِ ازدواج کو ایک حد میں رکھا اور مرد کو ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی' لیکن اس کے ساتھ قرآن نے یہ بھی واضح فرما دیا: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ (النساء:۳) ''اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم ازواج میں عدل قائم نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے''۔ آج کے اس دور میں مرد ایک بیوی کے حقوق بھی پوری طرح ادا کرنے میں غفلت اور حق تلفی سے کام لیتے ہیں' کجا یہ کہ دو' تین یا چار بیویوں کے مابین عدل اور حقوق کا توازن برقرار رکھنا!

اس ضمن میں نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ضرور ہے' مگر قرآن وحدیث میں ہمیں اس کی کوئی ترغیب نہیں ملتی اور نہ ہی کل قیامت کے دن مردوں سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے ان نامحرم عورتوں سے (بیوائیں ہوں یا مطلقہ' یتیم ہوں یا غریب) شادی کیوں نہیں کی؟ البتہ جس عورت سے شادی کی ہے اور جو تمہاری اکلوتی بیوی ہے اس کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں تم سے ضرور سوال ہوگا۔ اور اگر تم نے اپنی بیوی کو معلقہ کر کے چھوڑ دیا یعنی نہ اُس کے حقوق ادا کرتے ہو اور نہ ہی اُسے طلاق دیتے ہو تو تم سے قیامت کے دن اس کے بارے میں ضرور پوچھ گچھ کی جائے گی۔

پاکستانی معاشرے میں دوسری شادی بہت بڑا جرم ہے

اسلام نے مرد کو ایک سے زیادہ شادی کی ترغیب اگرچہ نہیں دی ہے' لیکن اس بات کی اجازت بہرحال موجود ہے کہ اگر تمہاری استطاعت ہے تو پھر تم ایک سے زیادہ بیویاں بھی رکھ سکتے ہو' لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ان بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کا معاملہ ہونا چاہیے۔ سورۃ النساء میں اس حوالے سے تفصیلی احکامات دیے گئے ہیں۔ آیت ۳ میں فرمایا:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳﴾

''اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کے علاوہ) جو عورتیں تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کر لو دو دو، تین تین یا چار چار۔ پھر اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک ہی عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم بے انصافی سے بچ جاؤ۔''

اس ضمن میں مزید راہنمائی ان الفاظ میں فرمائی گئی:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ﴾ (النساء:۱۲۹)

''اور تمہارے لیے ممکن نہیں کہ تم عورتوں کے درمیان پورا پورا انصاف کر سکو، چاہے تم اس کے لیے کتنے ہی حریص ہو، تو ایسا نہ ہو کہ تم ایک ہی طرف پورے کے پورے جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلّق کر کے چھوڑ دو۔''

یہاں واضح الفاظ میں ایک سے زیادہ بیویوں کے حوالے سے رہنمائی دی جا رہی ہے کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک رکھو کہ ازواج کے معاملات میں افراط و تفریط نہ رہے۔ مزید رہنمائی کے لیے ہم سیرتِ محمدیؐ میں سے ازواج کے مابین عدل کے معاملے کو جانچنے کے لیے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو نبی اکرم ﷺ (ان کے بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے) طلاق دینے کے قریب تھے تو انہوںؓ نے اپنی رات کی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی جو کہ نوجوان تھیں۔ اس واقعہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ بوقت ضرورت کسی بیوی کے ہاں ایک رات سے زیادہ رہنا بھی عدل ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

اسلام میں اگرچہ مرد کو دوسری شادی، بلکہ اس سے بڑھ کر بیک وقت چار بیویاں تک رکھنے کی اجازت ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں مرد کی دوسری شادی کو ایک بہت بڑا جرم، بلکہ اس سے بڑھ کر گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ بیوی کو اگر یہ معلوم ہو کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور وہ اس کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی رکھتا ہے تو اسے یہ بات تو گوارا ہو گی کہ وہ یہ گناہ کماتا رہے، لیکن اگر وہ دوسری شادی کر لیتا ہے تو پھر گویا قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔

اسلام میں تو دوسری شادی کے لیے مرد کو اپنی پہلی بیوی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے، لیکن پاکستان کے آئین و قانون (جس کو والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور منافقت کا پلندہ کہتے تھے) میں یہ بات درج ہے کہ پہلی بیوی کی اجازت سے ہی مرد دوسری شادی کر سکتا ہے۔ چونکہ بیوی یہ اجازت کبھی دے ہی نہیں سکتی، لہٰذا مرد کے گرد یہ زنجیر پہنا کر اس کو بے حیائی کے دروازوں میں دھکیل دیا گیا ہے اور وہ دوسری شادی تو نہیں کر پاتا مگر زنا جیسے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے کا المیہ

ہمارے پاکستانی معاشرے کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر ہندوانہ تہذیب و تمدن کا دلدادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکی کو گھر سے رخصت کرتے ہوئے والدین تلقین کر کے بھیجتے ہیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنا کہ وہ بس صرف تیرا ہی ہو جائے، تیری مٹھی میں آ جائے اور تو بھی صرف اُسی کی ہو جانا۔ یہ فقرے کسی طور پر درست نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم صرف اللہ کے ہیں اور اللہ ہی ہمارا رازق، قادرِ مطلق، ہمارا محبوب اور ہمارا اصل مقصود و مطلوب ہے۔ اللہ کے احکامات کے اندر شوہر اور بیوی آپس میں محبتیں اور اطاعتیں کر سکتے ہیں، لیکن اصل خالق و مالک اللہ کو ہی سمجھنا چاہیے۔ جب بیوی اس کے برعکس اپنے خاوند کو ہی سب کچھ سمجھ لیتی ہے تو وہ اسی سوچ میں تمام عمر گھلتی رہتی ہے کہ میں اس کی خاطر اتنا کچھ کرتی ہوں، لیکن میرا شوہر پھر بھی میرا نہیں ہوتا۔

بارہا بیوی کے منہ سے یہ شکوے نکلتے رہتے ہیں کہ میں نے اپنی ساری زندگی اپنے شوہر پر قربان کر دی —— اور واقعتاً وہ شوہر کے کچھ ایسے خود ساختہ فرائض بھی اپنے ذمے لے لیتی ہے جو اس کے ذمے نہیں ہوتے —— پھر بھی یہ دوسری شادی کی بات کرتے رہتے ہیں۔ فلاں عورت کے اخلاق کی، شکل و صورت اور خوبصورتی کی اور دوسرے اوصاف کی تعریف کرتے رہتے ہیں اور مجھ میں تو ان کو کچھ نظر ہی نہیں آتا، وغیرہ۔ یہ غم کہ ''شوہر میرا نہیں'' بیویوں کو کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے، حالانکہ شوہر اُسی کا ہوتا ہے، اس کے حقوق ادا کر رہا ہوتا ہے، اس کے نان نفقے کے علاوہ بھی دوسری بہت سی فرمائشیں اور مطالبات پورے کر رہا ہوتا ہے، لیکن لڑکی کے دماغ میں یہ جذبہ بہرحال موجود رہتا ہے کہ اس کو کسی نہ کسی طرح مٹھی میں لینا ہے تاکہ وہ کسی اور عورت کی طرف رغبت نہ رکھ سکے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے چونکہ مرد کو دوسری شادی کی اجازت دی ہے' لہٰذا اس کی جبلت کے اندر چار بیویوں کے درمیان عدل کرنے اور ان کے باقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے۔ وہ عام طور پر جتنی ایک بیوی سے محبت کرتا ہے' اتنی ہی وہ چار کو بھی دے سکتا ہے' باوجود اس کے کہ پہلی بیوی سے محبت کم نہیں ہوگی۔ یہ گنجائش اللہ نے اس میں رکھی ہے' لیکن چونکہ مرد بھی سوچے سمجھے اور فرائض کا شعور و ادراک رکھے بغیر دوسری شادی کرتا ہے' لہٰذا بہت جلدی محسوس ہوتا ہے کہ معاملہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ محسوس ہوتا تھا۔ ایسے مایوس کن حالات میں ہمارے معاشرے میں دوسری شادی ایک ''گالی'' بن چکی ہے اور خلع و طلاق کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں۔

بعض اوقات بیویوں کو یہ ''مان'' ہوتا ہے کہ میں شوہر کی اتنی چہیتی ہوں کہ اگر میں خود بھی شوہر کو دوسری شادی کا کہہ دوں تو وہ پھر بھی دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ اس مان میں کہہ دیتی ہے کہ اگر دوسری شادی کرنی ہو تو کر لینا' لیکن مجھے ضرور بتا دینا' چھپ کر نہ کرنا' اس لیے کہ اس سے ہمارے درمیان بداعتمادی پیدا ہوگی۔ اس صورتحال میں اگر شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے اور اپنی اس دوسری شادی کے بارے میں پہلی بیوی کو بتاتا ہے تو گھر کی فضا یکدم پلٹ جاتی ہے۔ گویا صف ماتم بچھ جاتی ہے' لڑکی کے گھر والے لڑکے کے گھر آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اس ''گناہ کبیرہ'' سے باز آ جائے۔ اور اگر وہ بتائے بغیر شادی کر لیتا ہے تو بھی یہی حال ہوتا ہے۔ مزید مرد پر خودغرض' ناقدرا' بداعتماد' خیانت کرنے والا' بے وفا وغیرہ کا ٹھپہ لگ جاتا ہے اور عورت کہتی پھرتی ہے کہ یہ تو میرا ہی حوصلہ تھا کہ ایسے مرد کے ساتھ میں نے اتنے سال گزارا کر لیا' اگر کوئی اور ہوتی تو اتنا عرصہ بھی نہ رہ سکتی۔

دوسری شادی سے متعلق چند اصلاح طلب باتیں

دوسری شادی کے ضمن میں ایک اور بہت غلط بات جو ہماری خواتین میں ضرورت سے زیادہ ہے' وہ یہ کہ جب کوئی مرد دوسری شادی کر لیتا ہے تو وہ کہنے لگ جاتی ہیں کہ لازماً پہلی عورت میں کوئی کمی ہوگی جس کی وجہ سے مرد نے دوسری شادی کر لی ہے۔ پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ آخر تمہارے اندر کیا کمی تھی' کیا عیب تھا' کیا اخلاقی فقدان تھا جو تمہارے میاں نے دوسری شادی کر لی؟ ایسے فقروں میں افسوس اور اظہارِ ہمدردی کے بجائے یہ گمان اندر پل رہا ہوتا ہے کہ یہ تھی ہی ایسی' لہٰذا اس کو سزا ملی۔ اس اعتبار سے ہمارا پورا معاشرہ اس معاملے میں

کئی جگہ گناہگار ہوتا ہے۔ ہم دانستہ اور غیر دانستہ طور پر جس کام (دوسری شادی) کو بہت برا کہہ رہے ہیں' اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جائز قرار دیا ہے اور وہ ناگوار' گناہِ کبیرہ یا بہت بری بات کیسے ہو سکتی ہے؟

اس ضمن میں ہمارے معاشرے میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو بہت اصلاح طلب ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ خود بھی ازدواجی زندگی کے مسائل و معاملات سے آگاہی حاصل کریں اور پھر اپنی اولاد کو بھی ازدواجی زندگی کے بارے میں حقائق کا سامنا کرنا سکھائیں۔ والدین کو چند باتیں اولاد کو ضرور سکھانی چاہئیں:

(۱) شادی سے پہلے کی زندگی اس امتحان کی تیاری ہے جو تادمِ آخر چلے گا۔ یہ والدین کے لیے بھی ایک طرح کا امتحان ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اس امتحان کے لیے کیسے تیاری کراتے ہیں۔ امتحان کے سوالات میں سے اہم ترین ذہنی' علمی' قلبی' اخلاقی اور عملی سوالات ہیں۔

(۲) ان سب کو ہم دنیا اور ذاتی مفادات کے لیے تیار کرتے ہیں یا صرف اللہ کی رضا اور اللہ کے احکامات کی تکمیل کے لیے؟ یعنی ہمارا سب کچھ اللہ کی بندگی کے سانچے میں ڈھل جائے' یہ سب سے بڑا امتحان ہے' یا سوال ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔

(۳) دوسری شادی کی ترغیب و تشویق دینا یا والدین کا بہو سے کسی بات پر انتقام لینے کی خاطر بیٹے کو دوسری شادی کے لیے تیار کرنا بہت غلط ہے۔ قرآن حکیم یا اُسوۂ رسولؐ میں ہمیں اس ضمن میں کوئی ایسی آیت یا حدیث نہیں ملتی کہ دوسری شادی کوئی بہت بڑی نیکی ہے' بلکہ اس سے اُلٹ معاملہ خود نبی پاک ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا۔ جب حضرت علیؓ نے دوسری شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''بخدا! دشمن خدا اور رسولِ خدا کی بیٹیاں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں''۔ مزید آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے فاطمہ کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور فاطمہ میرے جگر کا گوشہ ہے''۔ لہٰذا حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی اور ان کی وفات کے تقریباً ہفتہ یا دس دن کے بعد حضرت علیؓ نے دوسری شادی کر لی۔ اس واقعے میں جہاں ایک طرف یہ بات سامنے آتی ہے کہ دشمن خدا اور رسول خدا کی بیٹیاں یکجا نہیں ہو سکتیں' وہاں یہ بات بھی قابل ذکر

ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''فاطمہ میرے جگر کا گوشہ ہے اور جس نے اسے تکلیف پہنچائی گویا اس نے مجھے تکلیف پہنچائی''۔ یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کتنی محبت تھی۔ چاہے یہ معاملہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ دوسرے کئی معاملات کی طرح 'خاص' ہی ہو' لیکن پھر بھی یہ دلیل ہے اس بات کی کہ لڑکی کے والدین اور خود لڑکی کے لیے یہ تکلیف دہ بات ہے کہ اس کا شوہر دوسری شادی کرے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس کی بیٹی پر سوکن آئی ہو اسے ہی درد کا صحیح پتا چلتا ہے۔

(۴) بیٹی کی شادی سے قبل والدین کو چاہیے کہ بیٹی کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے حقائق کا سامنا کرنا سکھائیں۔ حقائق چونکہ ہمیشہ تلخ ہی ہوتے ہیں لہٰذا دوسری شادی بھی انہی تلخ حقائق میں سے ایک ہے۔ حالات کے دھارے پر بہہ جانے کے بجائے حالات سے مقابلہ کرنا سکھانا چاہیے۔ ہم دوسری شادی کے بارے میں کتنے ہی خطرات یا مشکلات کیوں نہ بیان کر دیں اس حقیقت سے منہ نہیں موڑ سکتے کہ ہمارے نبی پاک ﷺ نے بھی چونکہ کثرتِ ازواج کا معاملہ رکھا اور مسلمان مردوں کو بھی چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دے دی ہے تو یہ عین جائز کام ہے۔ اسے ظلم' زیادتی' بے وفائی' خود غرضی' عورتوں کے پیچھے لگنے والا' جو مرضی کہہ لیں' نامہ اعمال تو ہمارا اپنا ہی خراب ہوگا۔

(۵) امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں مردوں (شوہروں) کے فرائض میں لکھا ہے کہ ایسے مرد جو غیر ذمہ دارانہ' غیر سنجیدہ اور نکھٹو ہوتے ہیں ان کو تو پہلی شادی بھی نہیں کرنی چاہیے جب تک خود ان کی اپنی تربیت نہ ہو جائے۔ لہٰذا مردوں کو بیویوں کے حقوق سے خوب اچھی طرح آگاہ کرنا (شادی سے پہلے) بہت ضروری ہے تاکہ وہ شادی کو گُڈا گُڈی کا کھیل نہ سمجھ لیں۔ اکثر و بیشتر دوسری شادیاں ''نیکی برباد گناہ لازم'' والی بات ہو جاتی ہے۔ اس لیے نیکی سمجھ کر مردوں کو اس بات پر ابھارنا یا ترغیب دینا درست نہیں ہے۔

(۶) بیوی کے علاوہ ہر نامحرم آپ کی ذمہ داری نہیں ہے' اور جو ذمہ داری نہیں ہے اس کے بارے میں قیامت کے دن آپ سے پوچھا بھی نہیں جائے گا۔

(۷) آخری بات یہ کہ میں نے والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے ایک دفعہ سوال کیا تھا' آپ کہتے ہیں کہ جب تک اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے' ناگزیر گزر اوقات کے لیے چند ناگزیر چیزوں سے گزارا کریں اور مکی دور جو اسلام کی مغلوبیت کا دور تھا وہاں ہمیں یہی نظر آتا ہے اور پورے مکی دور میں نبی پاک ﷺ نے بھی صرف اور صرف ایک ہی شادی کی' تو

آج بھی اسلام مغلوب ہے' لہٰذا ہمیں بھی یہاں سے رہنمائی ملتی ہے کہ جب تک اسلام غالب نہ ہو جائے تو نبی پاک ﷺ کے اسی اسوہ پر عمل کریں (اور اسلام کے غالب ہونے کا انتظار کریں)۔ اس پر والد صاحب نے فرمایا تھا کہ ''میں کب کہہ رہا ہوں کہ دوسری شادی ضرور کرو۔''

دوسری شادی کے ناگوار ہونے کی وجوہات

پاکستانی معاشرے میں مرد کی دوسری شادی کو ناگوار کیوں سمجھا جاتا ہے' میرے خیال میں اس کی چند ایک وجوہات لازمی ہیں' جو ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

(۱) ہندوانہ ذہنیت۔ ہمارے معاشرے کی اجتماعی سوچ ہندوانہ ہو چکی ہے اور یہی دوسری شادی کے ناگوار ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

(۲) لڑکی میں احساسِ کمتری کا شکار ہونے کا خوف کہ شاید مجھ میں کوئی کمی ہے یا میں لازمی کمتر ہو جاؤں گی۔

(۳) لڑکے کا عدل پر قائم نہ رہنا اور پہلی بیوی کے بھی حقوق ادا نہ کرنا۔

(۴) لڑکے کا اکثر و بیشتر لڑکی کو یہ باور کراتے رہنا اور ڈراتے رہنا کہ میں دوسری شادی کر لوں گا۔

(۵) لڑکی کا اپنے شوہر کو مولائے کُل اور مختارِ کُل سمجھ لینا کہ شاید حافظ' ناصر' رازق' مالک' سب کچھ اُس کا شوہر ہی ہے اور ان ہی مفادات کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کو قابو میں رکھنا چاہتی ہے اور اس میں کسی کے شریک ہونے کو بہت برا سمجھتی ہے۔ اس تناظر میں وہ اپنے مالک حقیقی کو ہمیشہ بھلائے رکھتی ہے' ہاں جب کوئی ٹھوکر لگتی ہے تو اللہ یاد آ جاتا ہے۔ کاش خواتین پہلے دن سے ہی شوہر کو ایک رفیق حیات سمجھیں اور اللہ تعالیٰ نے جو حقوق ہم پر ہمارے شوہروں کے عائد کیے ہیں انہیں وہ للّٰہیت کے جذبے سے احسن طریقے سے ادا کریں' جبکہ ان کی محبت کا مرکز و محور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ' اُس کا رسول اور قرآن حکیم بن جائے اور ہمارا دل اس شعر کے مطابق ہو جائے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی!

(۶) اکثر شوہروں کو بھی حقیقت میں اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں ہوتی' کیونکہ محبت کے

تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں‘ اس لیے کہ جس سے حقیقی محبت ہو اس کا دل نہیں دکھایا جاتا۔ جبکہ دوسری شادی میں تکلیف بھی ہوتی ہے اور بیوی کا دل بھی بہت دکھتا ہے۔ اسی طرح خواہشات کا احترام بھی محبت میں ہی کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ رشتہ ہے ہی ضرورتوں کے پورے کرنے کا نام‘ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْیَا مَتَاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْءَۃُ الصَّالِحَۃُ)) (صحیح مسلم) ’’دنیا تو ہے ہی متاع (سامانِ زیست) اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت (بیوی) ہے‘‘۔ متاع استعمال کی چیزوں اور ضرورت کی چیزوں کو کہتے ہیں اور استعمال کی چیزوں سے محبت نہیں کی جاتی بلکہ ان کو احتیاط سے استعمال کیا جاتا ہے۔

حرفِ آخر

یہ دنیا کی زندگی ہمارا امتحان بھی ہے اور ایک ڈرامہ (لہو ولعب) بھی ہے۔ امتحان اس لحاظ سے کہ اس زندگی میں جو عمل ہم کر جائیں گے آخرت میں اسی کا پھل پائیں گے‘ اس لحاظ سے یہ چند روزہ زندگی بہت قیمتی ہے۔ لہو ولعب یا ایک ڈرامہ اس لحاظ سے ہے کہ جیسے عام طور پر ڈرامہ تین گھنٹے کا ہوتا ہے جس میں کوئی باپ ہے‘ کوئی ماں ہے‘ کوئی بیٹی ہے‘ تو کوئی بھائی۔ پھر اس ڈرامے کو کامیاب بنانے کے لیے ہر کردار اپنے حصے کے کردار کو نہایت محنت اور کامیابی سے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر جب ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے تو نہ کوئی کسی کا باپ رہتا ہے‘ نہ بیوی‘ نہ بیٹا‘ نہ بیٹی اور نہ شوہر۔ نہ ڈرامے کے اندر کی محبتیں باقی رہتی ہیں‘ بس ایک لگن ہوتی ہے کہ یہ تین گھنٹے کا ڈرامہ کامیاب ہو جائے۔ ہر کردار یہ چاہتا ہے کہ میری پرفارمنس سب سے اچھی ہو اور سب سے زیادہ میرے کردار کی تعریف ہو۔ الغرض ہماری زندگی بھی درحقیقت تین چار گھنٹے کا ڈرامہ ہے جس میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے کچھ کردار دیانت داری سے نبھانے کو دیے ہیں جو ہمارے فرائض ہیں اور ہمارے رشتہ داروں کے حقوق ہیں‘ یعنی شوہر بیوی کے حقوق‘ والدین اور اولاد کے حقوق‘ رحمی رشتوں کے حقوق وغیرہ۔

پھر جب ہم آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جائیں گے تو آیاتِ قرآنی کے مطابق ہم کہیں گے: ﴿لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ﴾ (المؤمنون:۱۱۳) کہ ہم تو دنیا میں بس ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ رہے ہیں (چاہے ۷۰ سال عمر گزار کے آئے ہوں)۔ وہاں تو ہمارے عزیز ترین رشتے بھی ہمارے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ کوئی کسی کو نہیں

پہچانے گا‘ نہ ماں باپ کو‘ نہ بہن بھائی کو اور نہ شوہر بیوی کو‘ بلکہ سب ایک دوسرے کے خلاف ہوں گے۔ (سورۃ المعارج‘ سورۂ عبس اور سورۃ الممتحنہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔) گویا جب زندگی کا ڈرامہ ختم ہوگا اور اپنے کردار کی کامیابی یا ناکامی کے ساتھ انسان رب کے حضور حاضر ہو جائے گا تو کوئی کسی کی محبت میں اس کو کوئی نیکی نہیں دے گا‘ خواہ وہ ہستی اس کے سامنے سزا کے لیے لے جائی جا رہی ہو اور نہ ہی انسان کو اس چیز کا کوئی غم ہوگا۔ پھر انسان کہے گا: ﴿یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾﴾ (النبا) ’’کاش میں مٹی ہوتا!‘‘ ﴿یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ﴿۲۸﴾﴾ (الفرقان) ’’ہائے میری بربادی‘ کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا‘‘۔ اس وقت انسان کی حالت اس شعر کی مانند ہوگی:

خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے!

اس لیے ہمیں چاہیے کہ اگر کسی سے محبت ہے تب بھی اور اگر محبت نہیں ہے تب بھی‘ سب مل کر آخرت کی کامیابی کی فکر کریں اور دنیا کی خواہشات کو چھوڑ دیں۔ بہرحال سو باتوں کی ایک بات کہ تمام محبتوں‘ اطاعتوں‘ مرضیوں کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ذات کو بنالیں۔ ہر نیکی کا بدلہ اس سے مانگیں اور بدلہ پورے سے بھی زیادہ ملنے کی پوری پوری امید رکھیں تو دُنیا کی ہر مشکل آسان ہوگی اور ہر نیکی محفوظ ہوگی‘ کبھی رائیگاں نہیں جائے گی اگر وہ اللہ کے لیے کی ہوگی۔

اس مضمون کا دوسرا حصہ‘ یعنی دوسری جائز چیز جسے ہمارے معاشرے میں ناگوار سمجھا جاتا ہے‘ اس پر آئندہ گفتگو ہوگی۔ (ان شاء اللہ!)

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 25 روپے

ذُوالقرنین، سدِّ ذُوالقرنین اور ---- یاجوج ماجوج (۶)

شاہین عطر جنجوعہ

اس دوران تباہ شدہ قوموں میں سے ایک ''یہودی قوم'' کی تاریخ کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

70 عیسوی میں رومی جنرل (Titus) کے ہاتھوں ہیکل سلیمانی کی تباہی کے بعد یہودی پوری دنیا میں تتر بتر ہو گئے۔ کوئی مشرق کی طرف بھاگ گیا تو کوئی مغرب میں جا بسا' کسی نے جنوب کا رخ کیا تو کوئی شمال میں جا چھپا۔ غرض جس کے جہاں سینگ سمائے اور جس طرف پناہ میسر آئی' وہاں گھس گیا۔ مشرق میں کچھ لوگ عرب کے علاقوں میں جا بسے' یہاں تک کہ مدینہ میں' مغرب میں اٹلی کے ساحلی علاقوں پر' جنوب کی طرف اسکندریہ کی بندرگاہ بھی انہیں ایک محفوظ پناہ گاہ میسر آ گئی۔ بہرکیف ان کا معتد بہ حصہ جنوبی یورپ کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو گیا۔ وہ روم کے اکثر اور سلطنت کسریٰ کے کچھ شہروں میں مذہبی اقلیت کے طور پر گمنام زندگی گزارنے لگے۔

بیت المقدس سے یہودیوں کا دوبارہ واسطہ' بیت المقدس کی اسلامی فتح کی ابتدا سے شروع ہوا۔ اس کے بعد ہزار عیسوی تک یہودی بالکل بے بس اور انتہائی پس ماندہ زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔ تقریباً ہزار عیسوی کے بعد سے ان کے حالات میں تدریجاً تبدیلی اور بہتری آنا شروع ہوئی۔

یورپ میں گیارہویں صدی عیسوی سے شروع ہونے والا لاطینی عیسائیت کا عروج یہودیوں کو اپنی طرف کھینچتا گیا۔ ہزار صدی عیسوی سے پہلے یہودی تہذیب اصلاً مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ قریب کی تہذیب تھی۔ یہودی زبان' سیاست' ثقافت وغیرہ درحقیقت مشرقِ وسطیٰ

☆ ''بحث ونظر'' کے عنوان سے شائع شدہ مضامین کے مندرجات سے ادارۂ میثاق کا اتفاق ضروری نہیں۔ وضاحت طلب امور کے لیے صاحب مضمون سے رابطہ کیا جا سکتا ہے:

(فون:03345080530) ای میل: shaeenattar@yaho.com

کے رنگ میں رنگی تھی۔ لیکن اس عرصے کے بعد سے 1500 صدی عیسوی کے زمانے تک یہودی مغربی عیسائی علاقوں میں منتقل ہونے لگے۔ یورپ میں تیزی سے ابھرتی مغربی عیسائیت بہت مختلف علاقوں پر مشتمل تھی' جس میں کثیر النوع نسلی' ثقافتی' لسانی آبادیاں تھیں۔ اس کثیر الانواع عناصر پر مشتمل آبادی میں جوڑنے والی واحد نمایاں شے رومن کیتھولک مذہب والا کلیسا تھا۔ یوں مغرب میں یہودی آبادیوں کے ابھرنے یا معدوم ہونے میں کلیسا کا اہم کردار تھا۔

یہودیوں کے بارے میں عیسائی نظریات دو جذبی تھے۔ عیسائی (مذہب کے) مصنفین کتب نے اپنی اناجیل (Gospels) میں سینٹ پال (St.Paul)' جو خود ایک بے گھر (Diaspora) یہودی تھا' کی تحریروں سے اثرات اخذ کیے اور اس کی تحریر میں یہودیوں کی طرف ایک رجحان نمایاں ہے۔ وہ یہ کہ' باوجود اس کے کہ (عیسائی عقیدے کے مطابق) عیسیٰ علیہ السلام رومیوں کے ہاتھوں صلیب پر چڑھے' عیسیٰ کی زندگی میں' خود حضرت عیسیٰ کی شخصیت پر ایمان نہ لانے والے یہودی علماء کا کردار نمایاں ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہودیوں کے دو بڑے جرم تھے۔ عیسیٰ کو مسیحا ماننے سے انکار اور ان کی موت کی سازش۔ اس بنیاد پر عیسائیوں کے یہودیوں کے بارے میں دو جذبی رجحانات تھے۔ ہزارویں صدی عیسوی سے قبل جب تک یہودی عیسائی علاقوں سے دور رہے' یہودی مسئلہ عیسائی ذمہ داروں کے لیے دبا رہا۔ 1000 صدی عیسوی تک یہودی اسلامی دنیا میں مرتکز تھے۔ ہزار صدی کے بعد مغربی عیسائی علاقوں میں یہودی آبادی کے بڑھنے سے دونوں گروہوں کے لیے اہم رابطے کا آغاز ہوا۔

عیسائی چرچ کے نزدیک باوجود اپنی کوتاہیوں کے یہودی عظمت والی قوم تھے۔ اسی وجہ سے چرچ بار بار یہودی حقوق کے تحفظ کے لیے ابتدا سے قانون بناتا رہا۔ بارہویں صدی سے پاپائنِ عیسائیت یہودیوں کے لیے باقاعدگی سے قانون وضع کرتے رہے جو یہودیوں کے حقوق کے لیے ایک بیان ہوتا جس میں انہیں شخصی تحفظ' ملکیت رکھنے کا تحفظ' بزور مذہبی تبدیلی سے آزادی اور یہودی مقدس مقامات کے لیے تحفظ شامل ہوتا۔ یہودیوں پر حملہ یا ان کی کوئی شے چوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ تیرہویں صدی میں یہودیوں پر ایک الزام کہ یہودی Passover (مذہبی رسم) میں عیسائی خون استعمال کرتے تھے' کو پاپائیت نے فیصلہ کن انداز میں رد کر دیا۔

ساتھ ہی ساتھ' عیسائی فکر کی یہودی بنیاد اور عبرانی بائبل کا عیسائی صحیفوں میں انضمام ایک نئی تشویش کو جنم دے بیٹھا' کہ نئے عیسائیوں پر کہیں یہودی نظریات نہ اثر کر جائیں.....! اس

تشویش نے دوروپ دھارے۔ روحانی سطح پر یہودیت کی بھرپور مذمت تاکہ ''عیسائی سچ'' اور ''یہودی غلطی'' کے درمیان فرق کیا جاسکے۔ عملی سطح پر یہودیوں کو عیسائیوں سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ تاکہ رابطے سے نقصان نہ ہو۔ لہٰذا یہودیوں کو آزادی تو تھی لیکن حد بندیوں کے ساتھ۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ تھی کہ (1) کوئی ایسی بات جو عیسائیت کی بے حرمتی کرے' اس کی اجازت نہیں تھی (2) عیسائی مکمل آزادی سے یہودیت کی مذمت کرتے لیکن یہودیوں کو عیسائیت پر تنقید کا حق حاصل نہیں تھا۔ یہودیوں کو عیسائیوں سے میل ملاپ سے روکنے کے لیے انہیں قصبوں کے خاص علاقوں میں رہنے کو کہا جاتا تاکہ عیسائیوں سے رابطہ نہ ہو۔ یہودیوں کے نمایاں نظر آنے کی عیسائی مذہبی وسیاسی ضرورت کی وجہ سے چوتھی Lateran (ایک جگہ) کونسل نے ان کو نمایاں لباس اور نمایاں بیج (badge) لگانے کا حکم دیا۔

بنیادی طور پر یہودیوں کا عیسائیت کو نقصان پہنچا سکنا ایک مذہبی تشویش تھی' لیکن یہودیوں کے بارے میں غلط گمانی وقت کے ساتھ ساتھ مذہب کے علاوہ دیگر معاملات پر پھیلنے لگی۔ اس نئے آباد علاقے میں ابتداءً یہود انتہائی محدود کردہ معاشی مواقع میں سے کچھ حاصل کرنے کے لیے آسکتے تھے اور کبھی بھی اپنے پیشے میں تنوع حاصل نہیں کر سکتے تھے (مثلاً بڑی جاگیروں کا مالک ہونا یا سیاسی بالادستی حاصل کرنا یہودیوں کے لیے ممکن نہیں تھا)۔

عوامی نظر میں یہودیوں کا مقام بہت گرا ہوا تھا۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ یہودی مغربی عیسائی علاقے میں نووارد تھے اور نووواردوں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ مغربی یورپی علاقے مذہباً یک جان' متجانس (homogeneous) تھے' یعنی سب عیسائیت پر مبنی۔ اس علاقے میں مذہباً واحد مختلف گروہ یہود تھے۔ یہ نمائندگی اس اقلیت کے لیے کبھی مثبت نہیں ہوسکتی تھی نہ ہوئی۔ یہودی پیشہ ورانہ اعتبار سے تجارت اور خاص طور پر گیارہویں اور بارہویں صدی میں بڑے پیمانے پر سود پر قرض دینے میں ملوث ہونے لگے۔ اس سے معاملہ اتنا بڑھا کہ 1215ء کی Lateran کونسل' جس میں یہودیوں کے لیے علیحدہ لباس کی بندش عائد ہوئی' میں یہودیوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ بڑے پیمانے پر زیادہ سودی معاملہ نہ کریں کیونکہ اس سے عیسائیوں کو نقصان ہو رہا ہے۔

یہودیوں کے بارے میں عیسائی نظریہ ہر سال ایسٹر (Easter) کے تہوار پر بار بار ابھرتا۔ صلیب سے پہلے ہونے والے واقعات' خود صلیب کی یاد' یہودی خیال کو انتہائی اشتعال انگیز طریقے سے عیسائی تخیل میں پرو لاتا۔ عیسائی سمجھتے کہ یہودی عیسائی نوجوانوں کے خون کو

اپنے Passover کے تہوار میں استعمال کرتے ہیں۔ Norwich پادری نے جس کا نام Thomas of Monnoutt تھا Norwich ہی کے جوان William کے قتل کا الزام' لاش ملنے پر یہودیوں پر لگایا۔ اس لیے کہ اس (پادری) کے خیال میں ایسا اُس جوان کا خون استعمال کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

اسی عرصے کے دوران یہودیوں سے عیسائیوں کی نفرت' ان کے نووارد ہونے' معاشی سرگرمیوں میں سیکولر مقتدرہ سے قریبی تعلق اور شہری علاقوں میں ان کی ابھرتی آبادیوں کی وجہ سے بڑھتی گئی۔ ان سب معاملات نے اپنا کام دکھایا۔ بارہویں صدی میں یہودیوں کی سودخوری میں تخصیص نے مزید جلتی پر تیل کا کام کیا اور عوامی نفرت بڑھی۔ اسی طرح جب Black Death (غالباً طاعون سے ہونے والی) سے لاکھوں افراد مرے اور معلوم ذرائع کا استعمال کرنے کے باوجود جب اموات پر قابو نہ پایا جاسکا تو جنوں اور جادوگرنیوں پر الزام لگایا گیا اور یہودیوں کی مشہور بدطینتی اور خصومت کی وجہ سے ان کو بھی بیماری پھیلانے والوں میں شامل کیا گیا۔ مذہب میں کسی یہودی کی عیسائیت کی انفرادی حیثیت میں کی جانے والی بے حرمتی سے مقامی عہدے دار نمٹ لیتے لیکن اگر پوری یہودی کمیونٹی کی سطح پر ایسا ہوتا تو اس کمیونٹی کو دربدر کر دیا جاتا۔ یہودیوں کا ناقابلِ اصلاح رویہ یہودی سودخوری کے اردگرد گھومتا تھا۔ یہودیوں کا سودی قرض دینا ترک نہ کرنا ان کو علاقہ بدر کرنے کا سبب بنایا جاتا۔ بعض دفعہ کوئی دنیاوی مقصد مثلاً مالیہ نہ ملنا (جو اکثر ان یہودیوں سے ڈرا دھمکا کر اکٹھا کیا جاتا تھا)' معاشرے کے کسی ایک (عوام) یا دوسرے (کلیسا) طبقے کو خوش کرنا' اندرونِ خانہ مقصد ہوتا تھا۔ ہر اخراج کی بنیاد یہودیوں کے کسی گناہ پر رکھی جاتی۔ مقامی/محدود سطح پر اخراج شمالی فرانس میں بارہویں صدی کے آخر میں ہوا۔ تیرہویں صدی کے آخر میں یہ رجحان بڑھا۔ 1290ء میں انگلینڈ سے نکالے گئے اور 1306ء میں شاہی فرانس سے۔

یہودیوں کے بارہویں صدی کے اختتام سے شروع ہو کر آئندہ صدیوں میں ہونے والے مختلف ممالک سے اخراج کے اٹھنے والے طوفان کی یہی مندرجہ بالا چند وجوہات تھیں۔ بعض دفعہ ملک بدری میں سیکولر اور دنیاوی مفادات ہوئے۔ اخراج کے لیے فتووں میں عیسائی تقویٰ کو سامنے رکھا جاتا۔ مثلاً Iberia سے یہودیوں کے اخراج کا بڑا جواز نووارد عیسائیوں میں (یہودیوں کی وجہ سے) دوبارہ آجانے والی ارتداد کی پھیلتی ہوئی لہر کو بتایا گیا۔ فرانس کے لوئی ہفتم (Louis VII) کے بیٹے آگسٹس نے قریب کی یہودی آبادی پر ایک عیسائی لڑکے کے (مبینہ) قتل کے الزام کی وجہ سے حملہ بھی کر دیا۔ (جاری ہے)

Feb. 2015
Regd. CPL No. 115
Vol. 64
No.2
Monthly **Meesaq** Lahore

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکرانگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501

maktaba@tanzeem.org